نامدار اور بوبی کے کارنامے ــــ 2

زہریلی چائے

ستّار طاہر

زہریلی چائے

نامدار اور بوبی کے کارنامے

حصّہ دوم

ستّار طاہر

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

گولی چلی!

مُختار کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیب کا ٹکڑا نیچے گِر گیا۔ اکرم کا چہرہ خوف سے پیلا ہو گیا۔ تھوڑی دور، ایک درخت سے بندھا ہوا، نامدار کا گھوڑا بوبی ہنہنانے اور زمین پر زور زور سے پاؤں مارنے لگا۔

تینوں دوست بادل کوٹ کے جنگل میں پکنک منانے کے لیے آئے تھے کہ اچانک انھیں گولیاں چلنے کی آواز سُنائی دی تھی۔ نامدار نے اپنے

ساتھیوں کی طرف دیکھا اور بولا :

"تم یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ بوبی پر سوار ہو کر اُسے درختوں کے درمیان سرپٹ دوڑانے لگا۔ مختار اور اکرم اُسے اُس وقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ نامدار بوبی پر سوار اُس طرف اُڑا جا رہا تھا جِدھر سے گولیاں چلنے کی آواز آئی تھی۔ ابھی اُس نے ایک فرلانگ کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ کُچھ فاصلے پر ایک جھاڑی کے پاس، دو آدمی زمین پر پڑے نظر آئے۔ اُس نے زور سے بوبی کی لگام کھینچی، پھر چھلانگ لگا کر نیچے اُترا اور تیزی سے اُن لوگوں پر جھُک گیا۔

دونوں شخص زخمی تھے۔ اُن کے لباس خون میں لت پت ہو رہے تھے۔

ایک تو درد سے کراہ رہا تھا اور دوسرا درد پر قابو پانے کے لیے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

نامدار نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ حملہ آوروں کا کہیں نام نشان نہ تھا۔ دونوں آدمی ہوش میں تھے۔ اُن کے لباس اور چہرے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ کھاتے پیتے گھرانے کے ہیں۔

نامدار کو خیال آیا کہ وہ اپنے ساتھ کُچھ دوائیاں اور مرہم پٹّی کا سامان لائے تھے کہ جنگل میں زخمی ہو جائے تو وہیں مرہم پٹّی کی جا سکے۔ لیکن ابتدائی طبّی امداد کا یہ سامان تو اکرم کے پاس تھا۔ اُس نے آس پاس نظر دوڑائی پھر بوبی کی طرف دیکھا، آگے بڑھ کر اس کی کمر پر تھپکی دی اور بولا:

”بوبی، اکرم اور مختار کے پاس جاؤ اور اُنہیں اپنے ساتھ یہاں لے آؤ۔“

بوبی سب کُچھ سمجھ گیا تھا۔ وہ اُسی لمحے ہنہناتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔

دونوں زخمی زمیں پر لیٹے نامدار کو دیکھ تھے۔ اُن میں سے جو کراہ رہا تھا، اس نے ناگوار انداز میں نامدار کی طرف دیکھا لیکن بولا نہیں۔ دوسرا زخمی مُنہ دوسری طرف کیے لیٹا رہا۔

نامدار نے پھر آس پاس کا اچھّی طرح جائزہ لیا۔ دو تھیلے اِن زخمیوں سے کُچھ فاصلے پر گِرے پڑے تھے۔ ایک تھیلے کو اُس نے جھُک کر اُٹھایا۔ اُس میں دوسرے کپڑوں کے علاوہ ایک سفید رنگ کا بڑا سا رومال بھی تھا۔

اُس نے رومال کو اُٹھایا، پھر تھیلے کو زمین پر رکھ کر زخمیوں کی طرف بڑھا اور ان کے زخموں کو رومال سے صاف کرنے لگا۔ زخمی خاموش رہے۔ گولیاں اُن کے جسموں کو چھُو کر گُزر گئی تھیں۔ کوئی زخم کاری نہ تھا۔ لیکن

خون بہہ جانے کی وجہ سے وہ کمزوری محسوس کر رہے تھے۔

نامدار نے جب اُن کے زخم صاف کر دیے تو بولا۔ "ابھی میرے ساتھی آ جائیں گے پھر مرہم پٹّی ہو جائے گی۔ خُدا کا شکر ہے کہ آپ کو زیادہ گہرے زخم نہیں آئے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔"

"مگر اُنھوں نے ہم پر گولی کیوں چلائی؟" ایک زخمی بولا۔

دوسرے زخمی نے بُرا سا مُنہ بنایا اور پھر تلخی سے کہنے لگا۔ "دُشمن سے کبھی خیر کی اُمّید نہ رکھنی چاہیے۔" نامدار اِس گفتگو کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ وہ بہت کُچھ پوچھنا چاہتا تھا، لیکن یہ سوچ کر چُپ رہا کہ ابھی اُسے خاموش ہی رہنا چاہیے۔ وہ رومال جس سے اُس نے اُن کے زخم صاف کیے تھے، خُون سے سُرخ ہو گیا تھا۔

آپ نہیں جا سکتے

اکرم اور مختار نے بوبی کو اکیلے آتے دیکھا تو اُن کے چہرے اُتر گئے اور دِل دھک سے رہ گئے۔

"نامدار کہاں ہے؟ بوبی اکیلا کیوں آیا ہے؟" اکرم بے اختیار چیخ اُٹھا۔

"کہیں ڈاکوؤں نے۔۔۔۔۔۔" مُختار کہتے کہتے رُک گیا۔

بوبی ہنہناتے ہوئے زور زور سے زمین پر پیر مارنے لگا۔

مُختار بولا۔ "یُوں لگتا ہے جیسے بوبی ہمیں لینے آیا ہے۔"

"دیکھو، دیکھو۔ وہ گھوم گھوم کر اُس طرف اشارے کر رہا ہے۔" اکرم نے کہا۔

دونوں نے تیزی سے تمام چیزیں سمیٹیں اور اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ بوبی آگے بھاگنے لگا۔

نامدار نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سُنی تو وہ مُسکرا دیا۔ "میرے ساتھی آ گئے۔"

کراہنے والا زخمی بولا۔ "تمہارے ساتھی یا دُشمن کے آدمی؟" نامدار نے کُچھ تعجّب سے اُس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "میرے ساتھی۔ آپ کسی

دُشمن کا ذکر کر رہے ہیں؟"

"جس نے ہم پر گولی چلائی تھی۔" زخمی بولا۔

اس سے پہلے کہ نامدار کُچھ پوچھتا، بوبی وہاں پہنچ گیا۔ اکرم اور مُختار نے نامدار کو صحیح سلامت دیکھا تو بہت خوش ہوئے، لیکن زخمیوں کو دیکھ کر کُچھ گھبرائے۔

"اکرم، ابتدائی طبّی امداد کی چیزیں نکالو۔" نامدار نے کہا۔

اکرم نے جلدی سے وہ تھیلا گھوڑے سے اُتارا جس میں مرہم پٹّی کی چیزیں تھیں اور سب مل کر زخمیوں کی مرہم پٹّی کرنے لگے۔ چند منٹوں میں یہ کام ختم ہو گیا۔ اُنھوں نے سہارا دے کر زخمیوں کو اُٹھا کر بٹھا دیا۔

"آپ کو بیٹھنے سے تکلیف تو نہیں ہوتی؟" نامدار نے پوچھا۔

"درد تو ہے، لیکن ہم یہ برداشت کرلیں گے۔" ایک زخمی بولا۔

"آپ لوگ کون ہیں اور کس نے آپ پر حملہ کیا؟" نامدار نے پوچھا۔ پھر تیزی سے بولا۔ "لیکن پہلے کُچھ کھا پی لیں۔ پھر باتیں کریں گے۔" یہ کہ کر اُس نے مُختار اور اکرم کو اشارہ کیا اور وہ کھانے پینے کی چیزیں لے آئے۔

زخمیوں کے آگے دستر خوان بچھا کر کھانا رکھ دیا گیا۔ وہ زخمی جو کراہ رہا تھا، اُس نے آہستہ سے کہا۔ "تُم بہت اچھّے لڑکے ہو؟"

"شکریہ۔" نامدار بولا۔ "یہ ہمارا فرض تھا جو ہم نے ادا کیا۔ آپ کھانا کھائیے۔ باتیں بعد میں ہوں گی۔"

"ہمیں شام سے پہلے پہلے مور کوٹ پُہنچنا ہے۔ کیا تُم اِس کا انتظام کر سکتے ہو؟" ایک زخمی بولا۔

"مور کوٹ؟ آپ بادل کوٹ کے نہیں ہیں؟" نامدار نے پوچھا۔

زخمیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اُن میں سے ایک بولا۔
"نہیں۔ ہم مور کوٹ کے ہیں۔"

مور کوٹ کا نام سُنتے ہی اکرم اور مُختار چونکے۔ نامدار بھی کُچھ حیران ہوا، لیکن اس نے اپنے تعجّب کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ "آپ کھانا کھائیے۔ ہم سے جو کُچھ ہو سکا، کریں گے۔ ویسے پہلے ہمیں یہ بھی تو اندازہ کرنا ہو گا کہ آپ سفر کر سکتے ہیں یا نہیں۔"

دونوں زخمیوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن بولے کُچھ نہیں۔ خاموشی سے کر جھُکا کر کھانا کھانے لگے۔

جب وُہ کھانے سے فارغ ہوئے تو اُن کے چہروں پر رونق دِکھائی دینے

لگی۔ نامدار نے بات شروع کی:

"اب بتائیے آپ کون ہیں، اور آپ کو یہ حادثہ کیسے پیش آیا؟"

زخمیوں میں سے ایک نے اپنی مونچھوں کو چھوا اور بولا۔ "میرا نام خوشی مُحمّد ہے، اور میرے ساتھی کا نام رشید خان ہے۔ ہم مور کوٹ کے جاگیر دار فضل خان کے ملازم ہیں۔"

نامدار، اکرم اور مُختار بڑی توجّہ سے اُس کی باتیں سُن رہے تھے۔ خوشی مُحمّد نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا:

"تمہیں عِلم ہو گا کہ مور کوٹ اور بادل کوٹ کے جاگیر داروں کے درمیان ایک مدّت سے جھگڑا چلا آ رہا ہے۔ اور اِس دُشمنی کے نتیجے میں ہر برس دو چار آدمی ہلاک ہو جاتے ہیں۔"

”ہمیں سب معلوم ہے، لیکن آپ یہ بتائیے کہ آپ کا اِدھر کیسے آنا ہوا؟“ مورکوٹ کے لوگ تو اِس علاقے میں کم ہی آتے ہیں۔“ مُختار نے کہا۔

”شاید تمہیں علم ہو کہ پچھلے دِنوں حکومت نے دونوں جاگیرداروں کو طلب کیا اور اعلیٰ افسروں نے اُن کو سمجھایا تھا کہ دونوں جاگیروں کے درمیان صلح ہونی چاہیے۔ مورکوٹ کے جاگیردار فضل خان اور بادل کوٹ کے جاگیردار نُور خان نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے اختلافات ختم کر دیں گے۔ اِس سِلسلے میں ہمارے جاگیردار نے ہمیں ایک پیغام دے کر بادل کوٹ کے جاگیردار نُور خان کے پاس بھیجا تھا۔“

”آپ کی جاگیردار نُور خان سے ملاقات ہوئی؟“ نامدار نے پوچھا۔ رشید خان ہنسا۔ اُسے دیکھ کر خوشی مُحمّد بھی مُسکرایا:

"ملاقات کے لیے ہی تو جا رہے تھے کہ ہم گولیاں چلا دی گئیں۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ بچ گئے۔ ہم تُمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھُولیں گے۔ اب ہم جلد از جلد واپس جانا چاہتے ہیں۔"

"لیکن کیا آپ نُور خان کو فضل خان کا پہنچائے بغیر ہی چلے جائیں گے؟"

"ہاں۔" رشید خان بولا۔

"مگر کیوں؟"

"ہمارے ساتھ جو سلوک ہوا ہے، اِس کے بعد بھی کوئی ایسی گنجائش رہ جاتی ہے کہ ہم اپنے دُشمنوں سے ملیں؟" رشید خان بولا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" نامدار نے کہا۔

رشید خان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر بولا۔ "ہمارے بادل کوٹ آنے کی اطّلاع صرف تمہارے جاگیر دار کو تھی، یا پھر ہمارے جاگیر دار کو۔ ہم پر گولیاں کس نے چلائیں؟ ہم یہ جان چکے ہیں۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔" نامدار بات سمجھ کر بولا۔

"ایسا ہی ہوا ہے۔ ہمیں تمہارے جاگیر دار نے مروانے کی کوشش کی تھی۔" خوشی محمّد بولا۔

"یہ غَلَط ہے۔" نامدار نے کہا۔ "مُمکن ہے کوئی ڈاکو ہوں۔"

"ڈاکو؟" خُوشی محمّد ہنسا۔ "ڈاکو ہوتے تو ہمیں لوٹتے۔ لیکن وہ تو گھوڑوں پر سوار آئے اور گولیاں برساتے ہوئے چلے گئے۔ ہمارے گھوڑے بھی لے گئے۔ نُور خان نے یہ اچھّا نہیں کیا۔ اب دونوں جاگیروں کی دُشمنی

پہلے سے زیادہ بڑھ جائے گی۔ بھلا کوئی گھر آئے مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتا ہے؟"

خوشی محمّد کا لہجہ بہت کڑوا ہو گیا تھا۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اِس علاقے سے نکل جانا چاہیے۔"

نامدار نے تیزی سے کہا۔ "مگر آپ نہیں جا سکتے۔"

"نہیں جا سکتے؟ کیوں؟" رشید خان نے چمک کر کہا۔ "اچھّا، میں سمجھا۔ تُم بھی توبادل کوٹ نے ہی ہو۔ ہمیں زخمی حالت میں دیکھ کر۔۔۔۔۔۔"

نامدار نے اُس کی بات پوری نہ ہونے دی اور ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ "مُجھے غلَط نہ سمجھیں۔ آپ کے زخموں سے خون رِسنے لگے گا۔ آپ کو آرام اور علاج کی ضرورت ہے۔ آپ میرے گھر چلیے۔ وہاں کُچھ دِن

ٹھہریے۔ پھر۔۔۔۔۔"

خوشی مُحمّد اور رشید خان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں کُچھ کہا، خوشی مُحمّد بولا:

"ہم تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتے۔ تمہارے جاگیردار کو علم ہو گیا کہ تُم نے ہمارا علاج کیا ہے، پناہ دی ہے تو وہ تُم سے ناراض ہو جائے گا۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔" نامدار نے کہا۔ "آپ میرے مہمان ہیں، اور آپ کی حالت ایسی نہیں کہ آپ کچھ کر سکیں۔"

خوشی مُحمّد اور رشید خان کُچھ سوچنے لگے۔ نامدار بولا۔ "دیر کرنا مناسب نہیں۔ شام ہونے والی ہے۔ آپ لوگ ہمارے ساتھ چلیں۔"

"ایک شرط پر۔" خوشی مُحمّد بولا۔ "تم ہمارے بارے میں کسی کو کُچھ نہ بتاؤ

گے۔"

"میں سمجھ گیا۔ میں کسی کو یہ نہیں بتاؤں گا آپ مورکوٹ کے رہنے والے ہیں۔ اگر بتانا بھی پڑا تو صرف اتنا بتاؤں گا کہ آپ مسافر ہیں، ڈاکوؤں سے جھڑپ ہوئی اور۔۔۔۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔" خوشی محمدؐ نے سر ہلا کر کہا۔

اکرم، مُختار اور نامدار نے ان کو سہارا دے کر اپنے ساتھ گھوڑوں پر بٹھایا اور پھر وہاں سے چل پڑے۔

آخری فیصلہ

جب گھوڑے بڑی حویلی کے اندر داخل ہوئے تو رشید خان اور خوشی مُحمّد نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ نامدار اُن کا مطلب سمجھ گیا تھا بولا :

"میں سردار کریم صاحب کا پوتا ہوں۔ میرا نام نامدار ہے۔ میرے والد سردار رحیم صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ والدہ بھی اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں۔"

"اوہ! تُم نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تُم ایک بہادر خاندان کے فرد ہو۔" رشید خان نے کہا۔

"چلیے، اب تو آپ کو علم ہو گیا۔ یہ میرے دوست مُختار اور اکرم ہیں۔"

رشید خان اور خوشی محمّد کے چہرے پر اطمینان بھری مُسکراہٹ دِکھائی دینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اُن کو ایک آرام دہ کمرے میں نرم نرم بستروں پر لِٹا دیا گیا اور حکیم صاحب کو بُلوا کر اُن کے زخموں کی مرہم پٹّی کرائی گئی۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ نامدار نے اکرم اور مُختار کو رخصت کیا اور اُنہیں ہدایت کی کہ جو باتیں ہوئی ہیں، اُن کا کسی کو عِلم نہیں ہونا چاہیے۔

نامدار چاہتا تھا کہ اُس کے مہمان زیادہ سے زیادہ آرام کر سکیں، اُس لیے وہ اُن کو اکیلا چھوڑ کر اپنے دادا سردار کریم کو سلام کرنے چلا گیا۔

”سُنا ہے حویلی میں دو زخمی آئے ہیں۔“سردار کریم نے پُوچھا۔

نامدار نے دادا جان کو بتایا کہ جنگل میں اُنہیں دو مسافر ملے تھے، اُنہیں ڈاکوؤں نے زخمی کر کے لوٹ لیا تھا۔ وہ اُن کو اپنے ساتھ لے آیا ہے۔

”یہ تُم نے اچھّا کیا۔“سردار کریم نے کہا۔”لیکن ایک بات ہے۔“

”وہ کیا، دادا جان؟“

”یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ وہ کسی خطرناک گروہ سے تعلّق تو نہیں رکھتے۔“

”نہیں، دادا جان۔ وہ ایسے آدمی نہیں ہیں۔“

”تُم ٹھیک کہتے ہو گے۔“سردار کریم نے کہا۔”لیکن بعض اوقات ڈاکوؤں کے اپنے اندر بھی تو جھگڑا ہو جاتا ہے۔“

نامدار خاموش رہا تو سردار کریم نے کہا۔ "اُن کے آرام کا پُورا خیال رکھنا اور کوئی ایسی بات نہ ہونی چاہیے جس سے ہماری مہمان نوازی پر حرف آئے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ حویلی کی روایات پر پورا عمل ہوگا۔"

"شاباش!" سردار کریم نے پیار سے نامدار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

رات کا کھانا نامدار نے مہمانوں کے ساتھ کھایا۔ خوشی مُحمّد اور رشید خان اُس کی مہمان نوازی پر بہت مسرور تھے اور بار بار شُکریہ ادا کرتے تھے۔ نامدار نے کھانے کے بعد اُن سے کہا کہ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بے تکلّف بتا دیں۔ ایک مُلازم اُن کے کمرے کے باہر موجود رہے گا۔ پھر وُہ ان سے اجازت لے کر چلا آیا۔

وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا تو حویلی کے ایک ملازم نے اُس سے کہا۔

"ایک شخص آپ ملنا چاہتا ہے۔"

"کون ہے؟" نامدار نے پوچھا۔

"نام نہیں بتاتا۔ گاؤں کا بھی نہیں ہے۔" ملازم نے بتایا۔

"اچھا، اُسے بیٹھک میں بٹھاؤ۔ میں آتا ہوں۔"

وہ کپڑے بدل کر بیٹھک میں گیا تو وہاں ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے گرم چادر اپنے سر اور مُنہ پر اِس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ باقی چہرہ چھُپا ہوا تھا۔

نامدار نے اُس کی طرف غور سے دیکھا، اور ملازم کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔

”کیسے آئے ہو؟“ نامدار نے پوچھا۔

ملاقاتی کُچھ نہ بولا۔ نامدار نے کہا۔ ”مُنہ کیوں چھُپا رکھا ہے؟ بتاؤ نا، کیا کام ہے؟“

ملاقاتی نے اپنے چہرے سے چادر اُتار دی۔ ”تُم۔۔۔!“ نامدار بولا۔ ”قمر خان!“

”ہاں، میں۔ تمہیں تعجّب ہوا؟“

”یقیناً۔ لیکن تمہیں اِس طرح مُنہ چھُپا کر آنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو یہاں میرے آنے کا عِلم ہو۔“ قمر خان بولا۔

”مگر کیوں؟“ نامدار نے پوچھا۔

قمر خان کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ نامدار ہی کی عُمر کا تھا، لیکن ہاتھ پاؤں کھُلے تھے، اِس لیے اپنی عُمر سے کُچھ زیادہ بڑا دِکھائی دیتا تھا۔ وہ بادل کوٹ کے جاگیر دار نُور خان کا سگا بھانجا تھا۔ نُور خان کا اپنا کوئی بیٹا نہ تھا، اور لوگوں میں مشہور تھا کہ جاگیر دار نُور خان کی اکلوتی بہن کا بیٹا قمر خان ہی جاگیر کا وارث ہو گا۔

"دُودھ پیو گے یا چائے؟ کھانا منگواؤں؟" نامدار نے پوچھا۔

قمر خان مُسکرایا اور بولا۔ "تمہارے گھر پہلے ہی دو مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اُن کی خدمت جی لگا کر کرو۔ میرے لیے کوئی چیز بھی منگوانے کی ضرورت نہیں۔"

"اوہ! وہ تو مُسافر ہیں۔ ڈاکوؤں نے اُن کا سب کُچھ لوٹ لیا اور زخمی بھی کر

دیا۔" نامدار نے کہا۔ "میں اچھّی طرح جانتا ہوں وہ کون ہیں، اور اِسی لیے یہاں آیا ہوں۔" قمر خان بولا۔

نامدار نے بھولپن سے پوچھا۔ "کون ہیں وہ، اور تُم اُن کے سِلسلے میں مُجھ سے کیوں ملنے آئے ہو؟"

قمر خان مُسکرایا اور بولا۔ "تُم خواہ مخواہ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ وہ دونوں مسافر مور کوٹ کے خوشی محمّد اور رشید خان ہیں۔ کیا یہ غَلَط ہے؟"

"اچھا، اگر یہ صحیح ہے تو پھر؟" نامدار نے پوچھا۔

"پھر یہ کہ تُم نے اُنھیں اپنے ہاں پناہ دے کر اچھّا نہیں کیا۔" قمر خان بولا۔

نامدار ایک دم بھڑک اٹھا، اور بولا۔ "قمر خان یہ میرا گھر ہے اور جو مسافر یہاں ٹھہرے ہیں وہ چور یا مفرور مُجرم نہیں۔ اپنے گھر میں مَیں جسے چاہوں

ٹھہراؤں۔ کسی کو اِس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

قمر خان بولا۔ "لیکن بلا وجہ دشمنی مول لینے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔"

نامدار نے غور سے قمر خان کی طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ "کھُل کر بات کرو، قمر خان۔"

قمر خان کے چہرے سے مُسکراہٹ غائب ہو گئی وہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔
"میں تمہارا دُشمن نہیں، دوست ہوں۔ تُم میری بات کا غَلَط مطلب لے رہے ہو۔ اگر میں تمہارا دوست نہ ہوتا تو یوں چھُپ کر نہ آتا۔"

نامدار خاموش رہا۔ اُس کے دِل میں بے چینی پیدا ہونے لگی تھی۔

"تم جانتے ہو کہ اُن پر کس نے گولیاں چلائیں؟" قمر خان نے پوچھا۔

"نہیں۔ مُجھے معلوم نہیں۔" نامدار نے جواب دیا۔

”تم واقعی بہت جلد باز ہو۔ تُم نے سوچنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی اور اُن دونوں کو اپنی حویلی میں لے آئے۔“

نامدار خاموش رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ قمر خان اپنے دِل کی بات جلدی سے کر دے۔

”یہ میرے ماموں اور بادل کوٹ کے جاگیر دار نُور خان کا حُکم تھا کہ مور کوٹ سے آنے والے دونوں ایلچیوں کو راہ میں ہی قتل کر دیا جائے۔“

نامدار کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ بولا ”مگر کیوں؟“

”اِس لیے کہ بادل کوٹ کا جاگیر دار ابھی نہیں چاہتا کہ مور کوٹ کے جاگیر دار کے ساتھ صلح ہو۔ پروگرام یہ تھا کہ اُن دونوں کو قتل کر کے اُن کی لاشیں مور کوٹ کے علاقے میں پھینک دی جائیں۔ مور کوٹ والوں کو یہ

تاثر دیا جائے کہ اُن کے آدمیوں کو، جو پیغام لے کر بادل کوٹ جا رہے تھے مور کوٹ کے لوگوں نے قتل کر دیا تاکہ یہ کہا جا سکے کہ مور کوٹ کے لوگ اور اُس کا جاگیر دار بادل کوٹ کے ساتھ صلح کرنے کے لیے تیّار نہیں۔"

قمر خان نے معنی خیز نگاہوں سے نامدار کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اب تُم اصل بات سمجھ گئے ہو گے۔ لیکن اِدھر اُن پر حملہ ہوا اور اُدھر اُن پر حملہ کرنے والوں نے تمھارے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سُنی۔ وہ اِس خوف سے بھاگ نکلے کہ اُن کو کوئی پہچان نہ لے۔ پھر بھی یہ سمجھا گیا کہ وہ دونوں جنگل میں کوئی مدد نہ ملنے کی وجہ سے مر گے اور لاشیں مور کوٹ کے علاقے میں پھنکوا کر مقصد حل کر لیا جائے گا۔ لیکن تُم نے اُن کی مرہم پٹّی کی، اُن کو کھانا کھلایا اور اُن کو اپنے ساتھ لے آئے۔"

نامدار کا خون کھولنے لگا تھا۔ وہ پھٹ پڑنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس نے اپنے غصّے کو قابو میں رکھا، اور پھر بولا :

"وہ کون ہے جِس نے تمہیں بتایا کہ یہ لوگ میری حویلی میں ہیں ؟"

قمر خان مُسکرا کر بولا۔ "یہ میں نہیں بتاؤں گا۔ البتّہ یہ بتا دوں گا کہ حملہ آوروں میں سے ایک چھُپ کر سب کُچھ دیکھ رہا تھا۔"

نامدار نے کہا۔ "اس طرح تو دونوں جاگیروں میں قتل و غارت گری کا بازار کبھی سرد نہ ہو گا۔ اچھّا خیر، اب تم یہ بتاؤ کہ تُم کس لیے آئے تھے ؟"

نامدار کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے قمر خان بولا۔ "تُم میرے دوست ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ماموں تُم سے ناراض ہوں۔"

نامدار نے قمر خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "اچھّا، تو اب

تمہارے خیال میں مُجھے کیا کرنا چاہیے؟"

قمر خان نے آنکھیں جھُکا لیں اور بولا۔ "ابھی میرے اور ایک دوسرے شخص کے علاوہ کسی کو علم نہیں کہ یہ لوگ کون ہیں۔ اِس سے پہلے کہ بادل کوٹ کے جاگیردار یعنی میرے ماموں کو حقیقت کی خبر ہو، تُم صُبح ہونے سے پہلے اِن دونوں کو اپنی حویلی سے چلتا کر دو۔"

"تاکہ راستے میں اِن کو قتل کر دیا جائے۔ میں اِس سازش میں شریک نہیں ہوں گا، بلکہ ابھی جاگیردار کے پاس جا کر اُسے سمجھاؤں گا کہ جو کُچھ وہ کر رہا ہے، غلَط ہے۔"

قمر خان اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "تُم ضدّی ہو۔ تُم اپنے دوست کو بھی مُصیبت میں ڈالنا چاہتے ہو۔ ذرا سوچو تو، جب ماموں جان کو علم ہو گا کہ میں نے

تمہیں سب کُچھ بتا دیا ہے تو وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔"

نامدار نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کُچھ سوچ رہا تھا۔ قمر خان پھر بیٹھ گیا۔ اُس کی نظریں نامدار کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

"میں جاگیر دار کے پاس نہیں جاؤں گا" نامدار بولا۔ "لیکن۔۔۔۔۔"

"ہاں، ہاں۔ بات پوری کرو۔" قمر خان نے بے چینی سے کہا۔

"لیکن میں اپنے مہمانوں کو بھی حویلی سے نہیں نکالوں گا۔ جب وہ پوری طرح صحت یاب ہو جائیں گے تو میں انہیں خود بادل کوٹ کی آخری حد تک چھوڑ کر آؤں گا۔"

قمر خان اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر غصّہ اور پریشانی دِکھائی دے رہی تھی۔

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" اُس نے دانت پیس کر کہا۔

"ہاں۔ میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ کر کیا ہے۔" نامدار نے جواب دیا۔

"لیکن اِس سے تمہیں کیا ملے گا؟" قمر خان نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا کہ مُجھے کیا ملے گا۔ نہ مُجھے کوئی لالچ ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ بادل کوٹ اور مور کوٹ کی دُشمنی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔"

"لیکن جب بادل کوٹ کا جاگیر دار ہی یہ نہیں چاہتا تو تم کیا کر سکو گے؟"

"اس کا جواب میں ابھی نہیں دے سکتا۔" نامدار نے کہا۔

قمر خان نے چادر کو سر اور چہرے کے گرد اچھّی طرح لپیٹ لیا اور چلتے ہوئے بولا۔ "وعدہ کرو کہ تُم کسی کو یہ نہیں بتاؤ گے کہ میں یہاں آیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔" نامدار نے کہا۔

قمر خان خاموشی سے منہ چھپائے کمرے سے نکل گیا۔

حملہ

نامدار گہری سوچوں میں ڈوب گیا۔

وہ سوچ رہا تھا، آخر بادل کوٹ کا جاگیر دار نُور خان مور کوٹ کے جاگیر دار فضل خان کے ساتھ دُشمنی ختم کیوں نہیں کرنا چاہتا؟ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا، بادل کوٹ اور مور کوٹ کے لوگوں کے درمیان دُشمنی کی داستانیں سُنی تھیں۔ اب تو دُشمنی ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ پہلے انگریز کا

زمانہ تھا۔ انگریز اپنے فائدے اور مطلب کے لیے لوگوں میں پھوٹ ڈالتا تھا۔ لیکن اب پاکستان بنے اتنا عرصہ ہو چکا ہے، پھر یہ جھگڑے کیوں؟

نامدار کی آنکھوں کے سامنے بادل کوٹ کے جاگیردار نُور خان کا سراپا گھوم گیا۔ لمبا تڑنگا قد، بھرا بھرا چہرہ، سانولا رنگ، بارُعب، بڑی بڑی آنکھیں، بڑی بڑی مونچھیں، آواز گرج دار۔

پھر وہ اپنے تصوّر میں مور کوٹ کے جاگیردار فضل خان کا سراپا لایا۔ وہ بھی لمبا تڑنگا تھا۔ رنگ صاف تھا۔ مونچھیں بڑی بڑی، آنکھیں چھوٹی، لیکن چمک دار اور تیز۔ اُس کی آواز میں بھی بڑا رُعب تھا۔

نامدار نے سوچا، اگر یہ دونوں اپنی ضِد چھوڑ دیں اور ایک دوسرے کے دوست بن جائیں تو علاقے کا امن بحال ہو سکتا ہے اور ہر برس جو لوگ جھگڑوں میں جان گنواتے ہیں اُن کی جانیں بچ جائیں گی۔ لیکن، کس طرح؟

حکومت کی خواہش کے باوجود بات اتنی بگڑ گئی تھی کہ مور کوٹ کے ایلچیوں کو بادل کوٹ کا جاگیر دار قتل کرا کے ایک بھیانک سازش تیار کر رہا تھا۔ آخر کیوں؟ کیا نُور خان امن نہیں چاہتا؟ اِس سوال کا جواب نامدار کے پاس نہ تھا۔ اُسے تو ابھی یہ بھی عِلم نہیں تھا کہ اِن سارے واقعات کے پیچھے کون سی حقیقت چھُپی ہوئی ہے۔ لیکن وہ یہ ضرور چاہتا تھا کہ مُلک میں امن و امان ہو۔ سب لوگ اپنے بھائیوں اور پاکستانیوں کی طرح مل جُل کر ہنسی خوشی رہیں۔

اِس امن اور سکون کے لیے نامدار سب کُچھ کرنے کو تیّار تھا۔ اُس نے دِل میں کہا: "اب یہ میری ذمّے داری ہے کہ خوشی محمّد اور رشید خان کا ٹھیک سے علاج ہو، اور جب وہ ٹھیک ہو جائیں تو میں اُن کو جاگیر دار نُور خان کے پاس لے جاؤں تاکہ جاگیر دار فضل خان نے جو پیغام بھیجا ہے، وہ

جاگیر دار نُور خان کو مل جائے۔ اِس کے بعد اِن دونوں ایلچیوں کو بحفاظت مور کوٹ پہنچا دیا جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور کتاب پڑھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد کتاب اُس کے سینے پر کھُلی پڑی تھی، اور وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ تقریباً آدھی رات کے بعد اچانک شور کی آوازیں سُن کر اُس کی آنکھ کھُلی۔ باہر سے ملازموں کے چیخنے چلّانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ فوراً اُٹھا اور ننگے پاؤں ہی باہر بھاگا۔ اُس کی چھٹی حِس نے اُسے ہوشیار کر دیا تھا۔ وہ اُس کمرے کی طرف بھاگا جہاں خوشی محمّد اور رشید خان کو ٹھہرایا گیا تھا۔ کمرے کے دروازے کے سامنے وہ ملازم کھڑا کراہ رہا تھا جسے نامدار نے مہمانوں کی خدمت کے لیے مقرّر کیا تھا۔ وہ زخمی تھا۔ دو اور مُلازم آس پاس کھڑے تھے۔ نامدار نے اُن پر ایک نگاہ ڈالی اور کمرے کے

اندر داخل ہوا۔

خوشی محمّد اور رشید خان سہمے ہوئے دِکھائی دیتے تھے۔ نامدار نے اُن کی طرف مُسکرا کر دیکھا اور بولا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں ابھی آیا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکلا، نوکروں کو ہدایت کی کہ وہ زخمی ملازم کی مرہم پٹّی کریں اور مہمانوں کا خیال رکھیں۔ پھر وہ حویلی کے صحن کی طرف بھاگا، جہاں کُچھ لوگ کھڑے تھے اور کُچھ باہر جارہے تھے۔

ایک ملازم نے نامدار کو سارا واقعہ سُنایا۔ اُس نے کہا :

"ہم سو رہے تھے، اور حویلی کے باہر دو چوکیدار حسبِ معمول پہرا دے رہے تھے کہ گھڑ سوار آئے۔ اُنھوں نے چوکیداروں پر حملہ کیا اور اُن کو زخمی کر کے اندر گھُس آئے۔ شور کی آوازیں سُن کر ہم لوگ جاگ گئے۔

حملہ آور حویلی کے اندر بھاگتے ہوئے اُس کمرے کی طرف گئے جہاں مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم شور مچاتے ہوئے اُن کے پیچھے بھاگے۔ وہ پیچھے پلٹ کر ہم سے اُلجھ پڑے۔ دست بدست لڑائی ہوئی اور جب اُنہوں نے دیکھا کہ وہ پھنس گئے ہیں اور بہت شور مچ گیا ہے تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔"

"ان میں سے کوئی شخص پہچانا گیا؟" نامدار نے پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"وہ تعداد میں کتنے تھے؟"

"سات آٹھ ہوں گے۔" جواب ملا۔

نامدار نے قدرے غصّے سے کہا۔ "اور تُم نے اُنہیں بھاگ جانے دیا؟ تُم

میں سے کسی کو اتنی عقل نہ آئی کہ اُن کے گھوڑوں پر قبضہ کر لیتے۔ افسوس! تُم نے ایک اچھّا موقع گنوا دیا۔"

"کُچھ مُلازم اُن کے تعاقب میں گئے ہیں۔" ایک شخص نے کہا۔

"اب کیا فائدہ۔ وہ کہیں چھُپ جائیں گے۔ تُم لوگ پہلے عقل اور ہوش سے کام لیتے تو ایسا نہ ہوتا۔"

سب لوگ کُچھ شرمندہ اور پشیمان سے دِکھائی لگے۔ نامدار کے ذہن میں کئی باتیں آ رہی تھیں۔ اُسے غصّہ بھی بہت تھا، لیکن وہ کسی کے سامنے اُس کا اظہار کرنا نہ چاہتا تھا۔ وہ پھر اُس کمرے کی طرف چل دیا جہاں خوشی مُحمّد اور رشید خان کو ٹھہرایا گیا تھا۔

خوشی مُحمّد اور رشید خان اُسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اُٹھ کر بیٹھ

گئے۔

"آپ لیٹے رہیں، آرام کریں۔" نامدار نے اُن سے کہا۔

"میں نے کہا تھا کہ ہمیں جانے دو۔" خوشی محمّد بولا۔ "لیکن تُم نے ہماری بات نہ مانی۔ اب یقین ہو گیا ہو گا کہ ہم سچّے تھے۔"

نامدار خاموش رہا۔ "لیکن جاگیردار کو یہ کیسے علم ہوا کہ ہم یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟" رشید خان بولا۔ "ضرور تمہارے اُن دو دوستوں میں سے کسی نے مُخبری کی ہو گی۔"

"ہر گز نہیں۔" نامدار نے کہا۔ "میرے دوست ایسی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتے۔"

"تو پھر جاگیردار نُور خان کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم یہاں ہیں؟"

نامدار کے پاس اِس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" خوشی مُحمّد نے رشید خان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

رشید خان نے نامدار کی طرف دیکھا اور بولا:

"ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"

نامدار کُچھ سوچ رہا تھا۔ وہ بولا۔ "میں سردار کریم کا پوتا ہوں۔ ہم لوگ اپنے مہمانوں کے لیے اپنی جان بھی قربان کر سکتے ہیں۔"

رشید خان طنز سے بولا۔ "اگر مہمان ہی قربان ہو جائیں تو پھر میزبان کی قُربانی کا کیا فائدہ۔"

"آپ مُجھ سے بڑے ہیں، ورنہ میں اِس بات کا بہت سخت جواب دیتا۔"

رشید خان اور خوشی محمّد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نامدار نے نرم لہجے میں کہا۔ "آپ کوئی فکر نہ کریں۔ جب آپ سفر کے قابل ہوں گے تو آپ کو مورکوٹ حفاظت سے پہنچا دیا جائے گا۔"

"ہم اب چلنے پھرنے کے قابل ہیں۔ تُم ہم پر اعتماد کر کے ہمیں دو گھوڑے دے دو۔ مورکوٹ جا کر ہم واپس بھجوا دیں گے۔"

"لیکن راستے میں بھی تو خطرہ ہو سکتا ہے۔" نامدار نے کہا۔

"خطرہ تو یہاں بھی ہے۔ ہم بال بال بچے ہیں۔"

"آپ میری بات مانیں اور ابھی جانے کا ارادہ نہ کریں۔" نامدار نے کہا۔

ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ ایک ملازم آیا اور اس نے نامدار سے کہا۔ "آپ کو بڑے سرکار یاد کر رہے ہیں۔"

"دادا جان۔ اوہ!" نامدار بولا۔ پھر اُس نے مہمانوں سے کہا۔ "آپ لوگ آرام کیجیے۔ میں ابھی دادا جان سے مل کر آتا ہوں۔" یہ کہ کر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

نیا فیصلہ

سردار کریم کے بوڑھے چہرے پر بلا کا جلال تھا۔ وہ نامدار کو دیکھتے ہی بولے۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

نامدار نے اُن کی طرف دیکھا۔ پھر سر جُھکا کر سب کُچھ بتا دیا۔ جنگل کا واقعہ اور ایک ایک بات، جو حقیقت تھی۔ سردار کریم سب کُچھ سُنتے رہے اور جب نامدار نے اپنی بات ختم کرلی تو بولے:

"تو یہ ہے اصل واقعہ۔ تُم نے پہلے مُجھ سے کیوں چھُپایا۔"

"میں خوشی محمّد اور رشید خان سے وعدہ کرچکا تھا۔" نامدار نے جواب دیا۔

"وعدے کا پاس کرنا اچھّی بات ہے، لیکن بات تو نکل چکی تھی۔ تمہارے خیال میں یہ مُخبری کس نے کی؟"

بُوڑھے سردار کریم کی نظریں نامدار کے چہرے پر گڑ گئیں۔ نامدار سوچ رہا تھا کہ قمر خان کے آنے کا واقعہ بتائے یا نہیں؟ پھر اُس نے دِل میں کہا کہ دادا جان سے کُچھ نہیں چھُپانا چاہیے۔ اس نے قمر خان کی اور اپنی ساری باتیں سردار کریم کو تفصیل سے بتا دیں۔

"ہُوں!" کہہ کر سردار کریم خاموش ہو گئے۔ پھر کُچھ دیر بعد نامدار کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "اب کیا سوچا ہے؟"

"جو آپ حکم دیں۔" نامدار نے جواب دیا۔

"اپنے مہمانوں سے کہہ دو کہ سردار کریم زبان دیتا ہے کہ اُن کا یہاں کوئی بال بھی بیکا نہ کر سکے گا۔ جب وہ سفر کے قابل ہو جائیں گے تو اُن کو بحفاظت مورکوٹ پہنچا دیا جائے گا۔"

"جی، بہتر۔"

"ان سے یہ کہہ دو اور خود بھی جا کر سو جاؤ۔"

"شب بخیر، دادا جان۔"

"جیتے رہو۔" بوڑھے سردار کریم نے کہا۔

نامدار نے خوشی محمد اور رشید خان کو دادا جان کا پیغام دیا تو اُن کی بے چینی کم

ہو گئی۔ نامدار اُن کو سونے کے لیے کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ لیکن نیند آنکھوں سے بہت دور تھی۔ وہ کروٹیں بدلتا اور سوچتا رہا کہ یہ سب کُچھ کیوں ہو رہا ہے، اور واقعی جاگیر دار نُور خان اس حد تک آگے بڑھ گیا ہے کہ اپنے آدمی ہماری حویلی میں بھیج کر مور کوٹ کے اِن آدمیوں کو قتل کرانا چاہتا ہے!

سارے گاؤں میں رات کے واقعہ کا چرچا ہو رہا تھا۔ ایسا کبھی سُننے یا دیکھنے میں نہ آیا تھا کہ سردار کریم جیسے بڑے آدمی کی حویلی پر کسی نے حملہ کرنے کی کوشش کی ہو۔ سردار کریم اِس علاقے میں، جائیداد اور اپنی خاندانی شُہرت کے اعتبار سے بادل کوٹ کے جاگیر دار نُور خان کے برابر تھا۔

لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے اور بے حد حیران تھے کہ کس کو اتنی جرأت ہوئی کہ وہ سردار کریم کی حویلی کے اندر زبردستی گھُس گیا۔ عام لوگوں

کا خیال تھا کہ وہ ڈاکو تھے جو حویلی لوٹنے آئے تھے۔ کسی کو اصل واقعہ کا علم نہ تھا۔ اور جن چند گھریلو ملازموں کو حقیقت کا علم تھا، اُنہیں نامدار نے سختی سے سمجھا دیا تھا کہ وہ اپنی زبانیں بند رکھیں۔

جس وقت گاؤں میں لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے، نامدار اپنے مہمانوں کے ساتھ ناشتا کر رہا تھا۔ اچانک ایک مُلازم اندر داخل ہوا اور بولا۔
"آپ کو بڑی سرکار نے یاد کیا ہے۔"

نامدار دادا جان کے کمرے میں پہنچا تو حیران گیا۔ وہاں پر بادل کوٹ کا جاگیر دار نُور خان بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ نامدار نے آگے بڑھ کر سلام کیا تو وہ بولا:

"ہمیں تو بھئی تم پر فخر ہے۔ تم نے بادل کوٹ کا نام اونچا کر دیا ہے۔"

نامدار کو یوں لگا جیسے جاگیر دار نُور خان اُس پر طنز کر رہا ہے۔ وہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ سردار کریم نے کہا :

"بیٹے، میں نے رات ہی نُور خان کو پیغام بھجوادیا تھا کہ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔"

نامدار کنکھیوں سے جاگیر دار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دِل میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ سوچتا تھا، کیا بات کروں، کیا کہوں، کون سی بات پوچھیوں اور کون سی نہ پوچھوں ؟

جاگیر دار نُور خان نے نامدار کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی اور بولا۔ "تم کُچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو، بیٹا۔"

نامدار نے دیکھا کہ اُس کے دادا جان بھی اُس کی طرف غور سے دیکھ رہے

ہیں۔ وہ دِل میں سوچ رہا تھا کہ کہیں دادا جان نے اور باتوں کے علاوہ قمر خان کی آمد کے بارے میں بھی جاگیر دار کو کُچھ بتا تو نہیں دیا۔ شاید دادا جان نے یہ بات محسوس کرلی تھی۔ اُنھوں نے جاگیر دار سے پوچھا :

"قمر خان بہت دِنوں سے نظر نہیں آیا۔ خیریت تو ہے؟ پہلے تو وہ آٹھویں دسویں نامدار سے ملنے آجاتا تھا، اور مُجھے بھی سلام کرلیتا تھا۔"

جاگیر دار نُور خان بڑا سمجھ دار تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ وہ سمجھ گیا کہ سردار کریم نے قمر خان کی بات بلاوجہ نہیں کی۔ لیکن اُس کا اِس وقت کیا موقع؟ یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ بولا :

"قمر خان سے میں کہہ دُوں گا کہ آپ اُسے یاد کر رہے ہیں۔ لڑکا ہے نا۔ اُس کی اپنی مصروفیات بھی تو ہیں۔ اِدھر آنا بھُول گیا ہوگا۔"

نامدار کا ذہن اب صاف ہو گیا تھا۔ اُس نے جاگیر دار سے کہا۔ "میں آپ کو سارا قصّہ سُناتا ہوں۔"

جب نامدار تفصیل سے ساری باتیں بیان کر چُکا تو آخر میں اس نے کہا۔ "اب آپ بتائیے کہ آپ کس نتیجے پر پہنچے؟"

جاگیر دار نُور خان نے اپنی مُونچھوں کو اُنگلیوں سے چھُوا اور پھر کہنے لگا۔ "جو کُچھ ہوا، وہ حیران کُن ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں تو دِل سے چاہتا ہوں کہ بادل کوٹ اور مور کوٹ کے تمام جھگڑے ختم ہو جائیں۔ لیکن یہ سب کُچھ کیوں ہوا؟ کس نے یہ شرارت کی؟ میں تو کسی مہمان کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"تو پھر وہ لوگ کون تھے اور کس نے بھیجے تھے، جنہوں نے راستے میں

خوشی مُحمد اور رشید خان کو قتل کرنے کی کوشش کی، اور جب ناکام رہے تو ہماری حویلی پر چڑھ دوڑے؟ جناب، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ جب تک کوئی بڑا اور با رسوخ آدمی ایسی سازش کے پیچھے نہ ہو، ایسی حرکت کرنے کی کوئی شخص جرأت اور نہیں کر سکتا۔" نامدار نے بڑے جوش سے کہا۔

جاگیر دار نُور خان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ اِس کے پیچھے ضُرور کسی کی سازش کام کر رہی ہے۔"

کمرے میں موجود تینوں افراد پریشان اور حیران دِکھائی دے رہے تھے۔

"اب کیا کرنا چاہیے؟" نامدار نے پھر بات شروع کی۔

جاگیر دار نُور خان نے سر دار کریم کی طرف دیکھا اور بولا۔ "آپ کی اجازت

ہو تو کُچھ عرض کروں؟"

"کہو!" بوڑھے سردار کریم نے کہا۔ "ہم بات توجّہ سے سُن رہے ہیں۔"

"میرے دِل میں ایک خیال آیا ہے۔ میں ابھی مورکوٹ کے اُن آدمیوں سے ملتا ہوں۔ جاگیردار فضل خان کا پیغام بھی وصُول کر لوں گا اور آپ اجازت دیں تو ان دونوں کو اپنے ساتھ اپنی حویلی لے جاؤں گا۔"

اِس سے پہلے کہ نامدار کُچھ کہتا، سردار کریم بولے۔ "عام حالات میں تو یہ اچھّا نہیں لگتا کہ ہم اپنے مہمانوں کو دوسرے کے گھر بھیج دیں، خواہ وہ ہمیں کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو۔ لیکن اس وقت مُجھے تمہاری تجویز اچھّی لگی ہے۔ اِس سے ایک تو مورکوٹ کے اُن آدمیوں کے دِل پر اچھّا اثر پڑے گا، دوسرے جاگیردار فضل خان بھی خوش ہو جائے گا۔ میری طرف سے

اجازت ہے۔ ویسے وہ دونوں نامدار کے مہمان، اور میرے خیال میں اِسے بھی کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“

نامدار کو اِس فیصلے سے شدید اختلاف تھا۔ وہ جاگیر دار نُور خان کو ابھی تک مشکوک آدمی سمجھتا تھا اور اُس پر بھروسا کرنے کے لیے تیّار نہ تھا۔ قمر خان نے اُسے جو کُچھ بتایا تھا، وہ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے دادا جان کی بات کو بھی رد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بولا :

”آپ جو فیصلہ کریں گے، بہتر ہو گا۔ مُجھے بھلا اِس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

جاگیر دار نُور خان کھڑا ہو گیا اور نامدار کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”چلو، مُجھے اُن کے پاس لے چلو۔“

نامدار نے اپنے بُوڑھے دادا کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور نامدار جاگیر دار نُور خان کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

پیغام

خوشی مُحمّد اور رشید خان بادل کوٹ کے جاگیر دار کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

جاگیر دار نُور خان نے اُن سے ہاتھ ملایا اور بولا:

"جو کچُھ ہوا میں اُس کے لیے شرمندہ ہوں، اگرچہ اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ یقین کرو جن لوگوں نے تمھاری جان لینے کی کوشش کی، میں اُنہیں ڈھونڈ نکالوں گا اور اُن کو ایسی سزا دی جائے گی کہ سارا علاقہ مدّتوں یاد

رکھے گا۔"

جاگیر دار کی باتیں سُن کر خوشی مُحمّد اور رشید خان کے چہرے کِھل اُٹھے۔ وہ بہت مطمئن اور خوش دِکھائی دے رہے تھے۔ خوشی مُحمّد بولا :

"نامدار نے ہماری جان بچائی، ہمیں اپنا مہمان بنایا۔ آخر وہ بھی تو بادل کوٹ کا ہے۔ اب آپ تشریف لائے ہیں تو ہمیں بے حد خوشی ہوئی ہے۔"

نامدار تیزی سے بولا۔ "ٹھیک ہے، میں بادل کوٹ کا ہوں، اور آپ مور کوٹ کے۔ لیکن ہم سب پاکستانی ہیں۔"

رشید خان بولا۔ "ہاں، ہم سب پاکستانی ہیں، نامدار۔ تم نے ٹھیک کہا۔"

"نامدار اور اُس کے دادا سردار کریم نے مجُھے اجازت دے دی ہے۔"

جاگیر دار نُور خان بولا۔ ”تُم میرے گھر رہو گے۔ جب تمہارے زخم بھر جائیں گے تو تمہیں واپس بجوادیا جائے گا۔“

نامدار نے دیکھا کہ ایک لحظے کے لیے خوشی مُحمّد اور رشید خان کے چہرے کا رنگ بدلا۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اِس کے بعد رشید خان بولا ”اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے تو ہمیں منظور ہے۔ ویسے ہمیں یہاں کوئی تکلیف نہیں۔“

جاگیر دار نُور خان نے اپنی مونچھوں کو انگلیوں سے چھُوا اور مُسکرا کر بولا۔ ”تُم ٹھیک کہتے ہو۔ جہاں نامدار میزبان ہو، وہاں کسی کو کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک بات اور بھی ہے۔“

”وہ کیا، جاگیر دار صاحب؟“ خوشی مُحمّد بولا۔ ”تم اپنے جاگیر دار فضل خان کا

پیغام لے کر میرے پاس آ رہے تھے، اِس لیے اصل میں تُم میرے مہمان ہو۔"

"جی، یہ تو ٹھیک ہے۔" رشید خان نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ میں پہلے آپ کو اپنے جاگیردار کا پیغام سُنا دوں۔" خوشی محمّد بولا۔

"ضرور۔ خوشی سے۔" جاگیردار نے کہا۔

"جناب، ہمارے جاگیردار نے آپ کے نام یہ پیغام بھیجا ہے کہ جس طرح اُنہوں نے ہمیں آپ کے پاس صلح کا پیغام دے کر بھجوایا ہے۔ اِسی طرح آپ بھی اپنے دو آدمی اُس کے پاس بھیجیں۔ پھر آپ جو تاریخ اور دِن موزوں لگے، اس دِن بادل کوٹ اور مور کوٹ کی سرحد کے درمیان آپ تشریف لائیں۔ ہمارا جاگیردار وہاں آپ کے استقبال کے

لیے موجود ہوگا۔ اس دِن دونوں جاگیروں کے لوگوں کے سامنے آپ اور ہمارا جاگیردار پگڑی بدل کر ایک دوسرے کے بھائی بن جائیں گے اور دونوں کے جھگڑے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔"

جاگیردار نُور خان نے اپنی مُونچھوں کو چھُوا۔ نامدار اُس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ آخر جاگیردار بولا:

"منظور ہے۔ جب تُم صحت یاب ہو کر واپس جاؤ تو میرا پیغام اُنھیں دے دینا۔ ہمارے دو آدمی جلد ہی تاریخ اور دِن بتانے وہاں پہنچ جائیں گے۔"

خوشی مُحمّد اور رشید خان بہت مسرور دکھائی دے تھے۔ جاگیردار نے نامدار کی طرف دیکھا اور بولا: "میں نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔" نامدار بولا۔ "خُدا اِس پر عمل کرنے کی ہم

سب کو توفیق دے۔"

سب لوگوں نے آمین کہا اور ایک دوسرے سے سب ہاتھ ملائے۔

ایک مر گیا

جاگیر دار نُور خان اپنے ساتھ مور کوٹ کے دونوں ایلچیوں کو اپنی حویلی میں لے گیا۔ اس کے جانے کے بعد نامدار نے اکرم اور مختار کو بُلوا بھیجا۔ تینوں دوست دیر تک ان واقعات پر غور کرتے رہے اور تینوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ آخر نامدار نے اپنے دوستوں سے مخاطب ہو کر کہا :

"میرا دِل کہتا ہے کہ کُچھ نہ کُچھ ہونے والا ہے۔ اس لیے ہمیں ہوشیار اور

چوکنّا رہنا چاہیے۔"

"مگر کس طرح؟" اکرم نے پوچھا۔ آس پاس نگاہ رکھو اور کوئی مشکوک واقعہ ہو تو فوراً مُجھے اطلاع کرو۔" نامدار نے جواب دیا۔

نامدار کر احساس تھا کہ اُس نے جو بات کہی ہے وہ بہت اُلجھی ہوئی ہے اور اُس کے دوستوں کی سمجھ میں اُس کا مطلب نہ آیا ہوگا۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا:

"ہمیں دیکھنا چاہیے کہ کوئی غیر معمولی بات تو نہیں ہو رہی۔ اِس کے علاوہ ہمیں خوشی مُحمّد اور رشید خان کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اُن کی حفاظت کا پورا انتظام کیا گیا ہے یا نہیں۔"

"مگر یہ کس طرح معلوم ہوگا؟" مُختار نے پُوچھا۔

نامدار نے جواب دینے سے پہلے کُچھ سوچا، پھر بولا۔ "ہمیں یہ ذمّے داری قمر خان کو سونپنی چاہیے۔"

"میں قمر خان کو بُلالاؤں؟" مُختار نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں آج خود اُس سے ملنے جاؤں گا۔ تُم بھی میرے ساتھ چلنا۔ لیکن جب میں اشارہ کروں تو تم ہمیں اکیلا چھوڑ کر دور چلے جانا۔"

تھوڑی دیر بعد تینوں دوست قمر خان سے ملنے اس کے گاؤں روانہ ہو گئے۔ قمر خان کا گاؤں نامدار کے گاؤں سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ تینوں گھوڑوں پر سوار تھے۔ بوبی بار بار خوشی سے ہنہناتا تھا۔ دوپہر کا وقت ہو چکا تھا۔ دھوپ میں تیزی آ چُکی تھی۔ لیکن چونکہ سردی کا موسم تھا، اِس لیے دھوپ بہت اچھّی لگ رہی تھی۔ نامدار اور اُس کے دوست

موسم سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔

ابھی وہ قمر خان کے گاؤں سے کُچھ ہی دُور تھے کہ اُنہیں گاؤں سے شور کی آوازیں سُنائی دیں۔ گاؤں وہاں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ نامدار نے دیکھا کہ گاؤں کے چوک میں لوگ ٹُکڑیوں کی صورت میں کھڑے ہیں اور اُونچی اُونچی آوازوں میں ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کر رہے ہیں۔

"خدا خیر کرے!" بے اختیار نامدار کے منہ سے نکلا اور اُس نے بوبی سے کہا۔ "بھاگو۔۔۔۔۔۔!" بوبی سرپٹ بھاگنے لگا۔

گاؤں کے لوگ گھڑسواروں کو دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ کُچھ لوگوں نے نامدار اور اُس کے دوستوں کو پہچان لیا۔ نامدار نے سلام کیا اور پوچھا: "کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟"

ہجوم میں کھڑا ایک بوڑھا بولا۔ "بیٹا، خیر نہیں ہے۔ ایک آدمی مر گیا ہے۔"

"اوہ! کون مر گیا؟" نامدار نے سوچا کہ گاؤں میں کسی کا انتقال ہو گیا ہے، اِس لیے اُس کی موت کا افسوس کر رہے ہیں۔

"مہمان، جاگیر دار کا مہمان جو مور کوٹ سے آیا تھا۔" بُوڑھا بولا۔

نامدار تیزی سے چھلانگ لگا کر نیچے اُترا اور چیخ کر بولا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟"

بُوڑھا کُچھ سہم گیا پھر بولا۔ "میاں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ وہ دو مہمان جو مور کوٹ سے آئے تھے، اُن میں سے ایک مر گیا ہے۔"

"مگر کیسے؟" نامدار نے پوچھا۔

"یہ تو مُجھے معلوم نہیں۔ سارے گاؤں میں شور مچا ہوا ہے کہ ایک مہمان مر

گیا ہے۔" بُوڑھا بولا۔

نامدار نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، لپک کر پھر بوبی پر سوار ہوا، اکرم اور مُختار کو اشارہ کیا اور تینوں تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ چند گلیوں اپنے سے گُزر کر وہ ایک شاندار حویلی کے سامنے پہنچے۔ حویلی کے دروازے کے سامنے گاؤں کے لوگوں کا ایک ہجوم جمع تھا۔

ہجوم اُن کو راستہ دینے کے لیے چھٹ گیا۔ نامدار اپنے دوستوں کے ساتھ حویلی کے بڑے پھاٹک کے اندر داخل ہو گیا۔ حویلی کے صحن میں وہ گھوڑوں سے اُترے اور اُنہیں تھان پر باندھ دیا۔ صحن میں کئی لوگ کھڑے نامدار اور اُس کے دوستوں کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

ایک آدمی آگے بڑھا اور اُس نے نامدار کا اِستقبال کیا۔ یہ نواز خان تھا، قمر

خان کا باپ اور نُور خان کا بہنوئی۔

"تمہارے گاؤں میں بھی یہ خبر پہنچ گئی؟"اُس نے نامدار سے پُوچھا۔

"نہیں۔ ہمیں تو یہاں آ کر معلوم ہوا۔" نامدار نے جواب دیا۔

"اوہ! کتنی حیران کُن بات ہے!" نواز خان نے کہا۔

"جاگیر دار صاحب کہاں ہیں؟" نامدار نے پوچھا۔ "اور قمر خان۔۔۔۔؟"
نواز خان بولا۔ "اندر کمرے میں ہیں۔ بُہت پریشان ہیں۔"

"میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔" نامدار نے کہا۔

"کُچھ دیر انتظار کرو۔ وہ ڈاکٹر سے بات چیت کر رہے ہیں۔"

"میرا مِلنا بہت ضروری ہے۔" نامدار بولا۔ "آپ بتا دیں، کس کمرے میں

ہیں۔"

نواز خان نے اُس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ "تمہارے دوست بھی تمہارے ساتھ جائیں گے۔"

نامدار نے ایک لمحے کے لیے کُچھ سوچا، پھر بولا۔ "نہیں۔ یہ باہر ٹھہریں گے۔"

"اچھّا تو چلو۔" نواز خان بولا۔ "میں تمہیں اُن کے پاس لیے چلتا ہوں۔"

نامدار نے اپنے دوستوں کو رُکنے کا اشارہ کیا اور خود نواز خان کے ساتھ حویلی کے اندرونی حصّے کی طرف چل دیا۔

ایک بڑے اور شان دار کمرے میں جاگیر دار نُور خان ایک سُوٹڈ بُوٹڈ آدمی کے ساتھ کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر پریشانی صاف دِکھائی دے رہی

تھی۔ وہ نامدار کو دیکھ کر چونکا۔ "تُم! تمہارے گاؤں میں بھی یہ خبر پُہنچ گئی؟"

اُس نے نامدار سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ میں یہاں آیا تو معلوم ہوا کہ۔۔۔۔" نامدار نے بات ادھوری

چھوڑ دی۔

"ہاں۔ غضب ہو گیا! رشید خان اچانک مر گیا۔"

"اوہ! مگر کیسے؟" نامدار نے کہا۔ "وہ تو اچھّا بھلا تھا۔ زخم بھی معمولی تھے،

اور اُس کا مناسب علاج بھی ہو رہا تھا۔"

"ڈاکٹر صاحب، یہ نامدار ہے۔ سردار کریم کا پوتا۔" جاگیردار نے اُس

آدمی سے نامدار کا تعارف کرایا۔

"ڈاکٹر صاحب، موت کیسے ہوئی؟" نامدار نے پوچھا۔

جواب دینے سے پہلے ڈاکٹر نے نُورخان کی طرف دیکھا۔ اُس نے سر ہلا کر اجازت دے دی کہ وہ نامدار کو سب کُچھ بتا سکتا ہے۔

"مُجھے معلوم ہوا ہے کہ نو بجے صُبح مرنے والے نے چائے طلب کی تھی۔" ڈاکٹر کہنے لگا۔

نامدار نے اپنے دِل میں کہا: "نو بجے یہ دونوں ہمارے گھر سے روانہ ہوئے۔ یہاں پہنچتے ہی رشید خان نے چائے طلب کی۔"

"جی؟ پھر، ڈاکٹر صاحب؟" نامدار نے پوچھا۔

"اُسے چائے دی گئی۔ اُس کے ساتھی نے چائے پینے سے اِنکار کر دیا تھا۔" ڈاکٹر بول رہا تھا۔ "چائے پیتے ہی اُس کی طبیعت خراب ہو گئی، اور اُس سے پہلے کہ کسی ڈاکٹر کو بُلوایا جاتا، وہ مر گیا۔ میرے خیال میں اُس کی

موت ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔“

نامدار کا دِل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ ایک خوفناک بات کا اندازہ لگانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اُس نے پوچھا :

”ڈاکٹر صاحب، کیا موت چائے پینے سے ہوئی؟“

”ہاں۔ میں اُس چائے کا تجزیہ کر چکا ہوں جو مرنے والے نے پی تھی۔ گلاس میں تھوڑی سی تلچھٹ باقی رہ گئی تھی۔“

”پھر۔۔۔؟“

”چائے میں زہر تھا۔“ڈاکٹر نے جواب دیا۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ جاگیردار پریشانی کے عالم میں بار بار اپنی

مُونچھوں کو چھُو رہا تھا۔ نواز خان کے چہرے پر بھی خوف اور پریشانی تھی۔ نامدار کا زنگ زرد پڑ چُکا تھا۔ اُس نے کھنکار کر کہا:

"ڈاکٹر صاحب، کسی شُبہ کی تو کوئی گنجائش نہیں؟"

"بالکل نہیں۔ میں لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا چُکا ہوں۔ شام سے پہلے وہاں سے بھی رپورٹ آ جائے گی۔"

چائے میں زہر۔ چائے میں زہر۔ زہریلی چائے۔ زہریلی چائے۔ نامدار کے کانوں میں یہ الفاظ گونجنے لگے۔ اُس نے جاگیر دار نُور خان کی طرف دیکھا اور بولا:

"خوشی محمّد کہاں ہے؟"

"کمرے میں۔"

"میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ بہت غصّے میں ہے۔ وہ بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ہم نے دروازہ بند کر کے اُسے بڑی مُشکل سے روکا۔ وہ بُہت شور مچا رہا تھا۔" جاگیر دار بولا۔

"بہر حال، میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر نامدار نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور بولا۔ "ڈاکٹر صاحب، آپ کو کب بلایا گیا تھا؟"

ڈاکٹر نے قدرے پریشانی اور حیرت سے نامدار کی طرف دیکھا، پھر بولا۔ "میں گاؤں میں ہی تھا۔ یہاں ایک شخص کو دیکھنے آیا تھا۔ اُسے فالج ہو گیا ہے۔ شور سُنا تو حویلی میں چلا آیا۔"

"آپ کو کیسے عِلم ہوا کہ رشید خان کو چائے پلائی گئی تھی؟" نامدار نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ شور سُن کر حویلی میں آیا تو اُسے مرنے والے کے پاس

لے جایا گیا۔ اُس نے اُس کی نبض دیکھی تو وہ مرچُکا تھا۔ اُس وقت اُس نے گھڑی میں وقت دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ایک ملازم نے بتایا کہ اُس نے مرنے والے کو چائے لا کر دی تھی۔ اُس ملازم سے ہی اُس نے اُس گلاس کی شناخت کرائی جو مرنے والے کے بستر کے قریب پڑا تھا۔ اُسے شُبہ ہوا اور اُس نے بچی کھچی چائے کے قطرے ایک کتّے کے سامنے ڈال دیے۔ اُس نے اُسے چاٹا تو درد کے مارے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اِس سے اندازہ ہوا کہ چائے زہریلی تھی۔ اِس کے بعد ڈاکٹر نے رُقعہ لکھا اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوایا۔ سرکاری ہسپتال وہاں سے دو میل دُور تھا اور یہ ڈاکٹر اسی ہسپتال کا اِنچارج تھا۔ نامدار نے جاگیردار نُور خان کی طرف دیکھا اور بولا۔ "پولیس کو اطلاع دی جا چکی ہے؟"

نُور خان کے بجائے نواز خان نے اُس کے سوال کا جواب دیا۔ "پولیس آ

چکی ہے، لیکن وہ حویلی میں داخل نہیں ہوگی۔"

"کیوں؟" نامدار نے پوچھا۔ "تفتیش کون کرے گا؟ قاتل کا سُراغ کیسے لگے گا؟"

"اِس کا انتظام کر لیا جائے گا۔" نواز خان بولا۔ "لیکن یہ حویلی کی روایت ہے کہ اِس کے اندر پولیس داخل نہیں ہو سکتی۔ تھانیدار اور اُس کا عملہ حویلی کے باہر ایک مکان کی بیٹھک میں موجود ہیں۔"

نامدار نے تیزی سے کہا۔ "یہ تو غَلَط بات ہے۔ پولیس کو تفتیش کرنے کے لیے ہر سہولت فراہم کرنی چاہیے۔"

نواز خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نامدار نے جاگیر دار کی طرف دیکھا اور پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے؟"

”نواز خان ٹھیک کہتا ہے۔ تھانیدار کو ساری بات بتا دی گئی ہے۔ وہ جِن لوگوں سے پوچھ کچھ کرنا چاہے گا، وہ اُس کے حوالے کر دیے جائیں گے۔“

نامدار ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔

”قمر خان کہاں ہے؟“ اُس نے پوچھا۔

”تھانیدار کے پاس ہے۔“ نواز خان نے کہا۔

”میں خوشی محمّد سے ملنا چاہتا ہوں۔“ نامدار بولا۔

جھُوٹے فریبی!

نامدار کمرے کے اندر داخل ہوا تو خوشی محمؐد دیوانوں کی طرح اُس کی طرف بڑھا اور اُسے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگا۔

"جھُوٹے! فریبی! قاتل! بادل کوٹ کے لوگ ظالم، فریبی اور قاتل ہیں۔"

نامدار نے آہستہ سے کہا۔ "مُجھے پہچانے میں تمھارا دوست ہوں۔ میرا گریبان چھوڑ دو۔"

"دوست؟ یہاں سب جعل ساز، فریبی اور قاتل ہیں۔ میرے دوست رشید خان کو تُم لوگوں نے زہر دے کر مار ڈالا۔" وہ چیخا۔

نامدار خاموش کھڑا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ خوشی مُحمّد اپنے دِل کی بھڑاس اچھّی طرح سے نکال لے۔

"بے ایمان! سازشی! قاتل!" خوشی مُحمّد چیختا رہا۔

اُس کے مُنہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ "قاتلو! ہم تُم سے بدلہ لیں گے۔ تُم سے، جاگیردار سے، بادل کوٹ کے ایک ایک بچّے سے۔"

"صبر سے کام لو۔" نامدار بولا۔

خوشی مُحمّد نے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا۔ "صبر سے کام لوں؟ میرے سامنے میرا دوست مارا گیا، اور میں صبر سے کام لوں؟ میں۔۔۔۔

میں۔۔۔۔۔۔“

وہ غصّے سے کانپ رہاتھا۔ اُس کے مُنہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

”میں تمہارے غم اور صدمے کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ یاد رکھو، جس نے رشید خان کو زہر دیا ہے، وہ بچ نہیں سکتا۔“

خوشی مُحمّد دیوانوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ ”ہاہاہا! بچ نہیں سکتا۔ ہم پر جنگل میں حملہ ہوا۔ وہ سب بچ گئے۔ ہم زخمی ہوئے۔۔۔۔۔ گھر میں ہمیں ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اب میرے یار کو زہر دے کر مار ڈالا۔۔۔ ہاہاہا! بچ نہیں سکتا۔ واقعی اب بادل کوٹ کے لوگ مور کوٹ کے لوگوں کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکتے۔“ وہ ہانپ رہاتھا۔ نامدار نے اُسے سہارا دے کر بستر پر لِٹا دیا۔ اُس نے مزاحمت نہ کی۔ نامدار نے اُسے پانی کا گلاس دیا جسے

وہ غٹا غٹ پی گیا۔ نامدار نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا :

"خوشی مُحمّد، مجھے بھی رشید خان کی موت کا افسوس ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اُسے مارنے والا بچ نہیں سکتا۔"

رشید خان کی اچانک اور ہولناک موت سے خوشی مُحمّد کو جو صدمہ پہنچا تھا، اس کی شدّت نے اب دوسری شکل اختیار کرلی۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اُس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگ گئے۔ وہ دیر تک روتا رہا اور اُس کی ہچکیوں سے کمرا گونجتا رہا۔ دروازے کے پاس کھڑے پُراشتیاق نگاہوں دیکھنے والے لوگوں کو نامدار نے ہاتھ کے اشارے سے وہاں سے جانے کے لیے کہا اور پھر دروازہ بند کرکے خوشی مُحمّد کے پاس بیٹھ گیا۔

جب خوشی مُحمّد جی بھر کے روچکا، اُس کی ہچکیاں ختم ہوگئیں تو اُس نے نامدار

کی طرف دیکھا اور بڑی سادگی اور معصومیت سے پوچھا: "جاگیردار کو رشید خان سے کیا دُشمنی تھی کہ اُسے زہر دلوادیا؟"

نامدار کا سارا جسم لرز گیا۔ اُس نے اپنے اوپر قابو پا کر کہا۔ "خوشی محمّد، اگر تُم نے بھی چائے پی ہوتی تو اِس وقت تُم یہ سوال نہ کر رہے ہوتے۔"

خوشی محُمّد کا سارا وجود لرز کر رہ گیا۔ پھر وہ اچانک اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "میں اب یہاں نہیں مر سکتا۔ مجُھے ابھی جانا ہے۔"

"ہاں۔" نامدار بولا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اب تم یہاں نہ ٹھہرو۔"

"کیا تُم مجُھے گھوڑا دے سکتے ہو؟"

"ہاں۔ دے سکتا ہوں؟"

"تو بس پھر چلو۔ مُجھے گھوڑا دو۔ میں ابھی یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔"

"مگر کہاں؟" نامدار نے پوچھا۔

"اپنے گھر، مور کوٹ۔"

"نہیں۔ ابھی تم یہاں سے نہیں جا سکتے؟"

"کیوں نہیں جا سکتا؟ اگر مُجھے گھوڑا نہ بھی ملا تو میں پیدل ہی روانہ ہو جاؤں گا۔ مُجھے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"تُم میرے ساتھ چلو گے، میری حویلی میں۔" نامدار لولا۔

خوشی محمّد نے قہقہہ لگایا، جس میں زہر بھرا ہو تھا۔ پھر بولا۔ "تاکہ تُم وہاں مُجھے کھانے میں زہر دے کر ختم کر سکو۔"

نامدار نے اُس کا ہاتھ تھام کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟"

خوشی مُحمّد نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بولا۔ "خبردار! مُجھے نہ روکنا۔ میں جا رہا ہوں۔"

اسی لمحے دروازہ کھلا اور جاگیردار نُور خان اندر داخل ہوا۔

شرط

جاگیر دار نُور خان کو دیکھتے ہی خوشی مُحمّد نے نفرت سے مُنہ پھیر لیا۔ نُور خان نے نامدار سے پوچھا۔ "خوشی مُحمّد کا غصّہ کُچھ کم ہوا؟"

"خوشی مُحمّد یہاں سے جانا چاہتا ہے۔" نامدار بولا۔ جاگیر دار کُچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ "ہمیں اس واقعے کی خبر مورکوٹ بھیج دینی چاہیے۔"

نامدار خاموش رہا۔ جاگیردار نے مونچھوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ "خوشی مُحمّد، جو کچُھ ہوا، بہت بُرا ہوا۔ ہمارے ماتھے پر کلنک لگ گیا، جو اُس وقت تک نہیں مٹ سکتا جب تک قاتل کا سُراغ نہ مل جائے۔"

خوشی مُحمّد خاموش رہا۔ اُس کے چہرے پر حقارت اور نفرت تھی۔

"تم جانا چاہتے ہو؟" نُور خان نے پوچھا۔

"ہاں" وہ بڑے اکھڑ انداز میں بولا۔

"سفر کر سکو گے؟" جاگیردار نے پوچھا۔

"سفر ہے ہی کتنا۔ بیس میل کا تو فاصلہ ہے۔" خوشی مُحمّد نے کہا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر جاگیردار تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

جب تک وہ واپس نہیں آیا، نامدار اور خوشی مُحمّد کے درمیان گفتگو نہیں ہوئی۔ دونوں، خاموش تھے۔

چند منٹ بعد جاگیردار اندر داخل ہوا۔ اُس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ وہ آتے ہی بولا۔ "میں نے تمہارے جانے کا انتظام کر دیا ہے۔ تمہارے ساتھ میرے دو آدمی جائیں گے، اور وہ جاگیردار فضل خان کو میرا رقعہ دیں گے۔"

خوشی مُحمّد کُچھ نہ بولا۔ وہ چپ چاپ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ نامدار اُس کے پیچھے لپکا اور اُس کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے کہنے لگا:

"میری آپ سے ایک درخواست ہے۔"

خوشی مُحمّد نے آنکھیں اُٹھا کر نامدار کی طرف دیکھا۔ "کہو۔ کیا درخواست

ہے؟" اُس کے لہجے میں تلخی تھی۔

"آپ مورکوٹ کے جاگیر دار اور لوگوں کو بھڑکائیں نہیں۔ بس میری یہی درخواست ہے۔"

وہ اب صحن میں پہنچ چکے تھے۔ خوشی مُحمّد چلتے چلتے رُک گیا اور چیخ چیخ کر بولنے لگا۔ "کیا کہا تُم نے؟ میں اپنے جاگیر دار اور اپنے لوگوں کو کُچھ نہ بتاؤں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تُم لوگ جُرم کرنے کے بعد بھی پارسا بننے کی کوشش کرتے ہو۔ ہم پر حملہ ہوا۔ ہم زخمی ہوئے۔ پھر میرے دوست کو زہر دے کر مار دیا گیا۔ اب تُم کہتے ہو کہ میں اُن کو سچ نہ بتاؤں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سُنو! اگر تُم چاہتے ہو کہ مورکوٹ اور بادل کوٹ کے درمیان خون کی ندیاں نہ بہیں تو پھر اُن لوگوں کو ڈھونڈو، جنھوں نے ہمیں زخمی کیا، ہمیں تمہاری حویلی میں قتل کرنے کی کوشش کی اور پھر میرے دوست کو

چائے میں زہر دے کر مار دیا۔ اُن قاتلوں کو ہمارے حوالے کر دو گے تو بات دب جائے گی۔"

خوشی محمّد بادل کوٹ کے دو آدمیوں کے ساتھ روانہ ہوا تو نامدار نے اُس کا گھوڑا روک کر کہا۔ "جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہے۔ بے گناہ لوگ مارے گئے تو اُس کے ذمّے دار آپ ہوں گے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ قاتلوں کو انجام تک پہنچا کر رہوں گا۔"

خوشی محمّد نے کوئی جواب نہ دیا۔

اُس کے جانے کے بعد مُختار اور اکرم نے نامدار کو بتایا کہ حویلی کے سامنے والے گھر کی بیٹھک میں قمر خان تھانیدار کے پاس بیٹھا ہے۔ نامدار نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"تم یہیں ٹھہرو۔ لوگوں کی باتیں سُنو۔ کوئی خاص بات سُننے میں آئے تو ذہن میں محفوظ کرلو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

نامدار نے بیٹھک کے بند دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو اندر سے آواز آئی۔ "کون؟"

کوئی جواب دیے بغیر نامدار نے دروازہ کھولا اور بیٹھک کے اندر داخل ہو گیا اور زور سے کہا۔ "السّلامُ علیکم۔"

"تم۔۔۔ آ گئے؟" قمر خان نے اُٹھ کر اُس کا استقبال کیا۔

"ہاں۔" یہ کہ کر نامدار نے تھانیدار سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ "میں آپ کی کارروائی میں مُخل تو نہیں ہوا۔"

"اچھّا ہوا کہ آپ آ گئے۔ آپ کا بیان بھی قلم بند ہونا ہے۔" تھانیدار نے

کہا۔

"میں حاضر ہوں۔" نامدار نے کہا۔ "کہیے، کُچھ سُراغ ملا؟"

"سب کُچھ آپ کے سامنے ہوگا۔ ابھی تو صرف ایک شخص کا بیان لیا گیا ہے۔ وہ میں آپ بتا دیتا ہوں۔" تھانیدار نے کہا۔

"شکریہ۔ آپ جانتے ہیں کہ مُجھے اِس واردات سے بُہت دِلچسپی ہے۔"

"مُجھے معلوم ہے۔ تھانیدار نے کہا۔ "حویلی میں ایک ملازم ہے، بھولا۔ عُمر اُس کی ساٹھ برس ہے۔ جب جاگیر دار صاحب خوشی مُحمّد اور مقتول رشید خان کو آپ کی حویلی سے اپنی حویلی میں لائے تو بھولے کو ان مہمانوں کی خدمت پر لگایا گیا۔ بھولے نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ رشید خان نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا کہ وہ چائے پینا چاہتا ہے۔ بھولے نے کہا کہ میں ابھی

بنوا کر لاتا ہوں۔ پھر خوشی محمد نے پوچھا کہ وہ اُس کے لیے بھی چائے لائے۔ خوشی محمد نے انکار کر دیا۔ بھولا چائے بنوانے کے لیے حویلی کے باورچی خانے میں گیا۔ وہاں اُس وقت ایک ملازمہ نُوراں موجود تھی۔ بھولے نے اُس سے کہا کہ مہمان کے لیے ایک گلاس چائے بنا دے۔

بھولا یہ کہہ کر باورچی خانے سے باہر آ گیا اور دوبارہ مہمانوں کے کمرے میں گیا۔ اُس نے رشید خان سے کہا کہ چائے بن رہی ہے۔ پانچ سات منٹ بعد وہ چائے لینے گیا۔ نوراں چائے بنا کر گلاس میں ڈال چُکی تھی۔ اُس نے گلاس بھولے کو دے دیا اور بھولا چائے کا گلاس لے کر مہمانوں کے کمرے میں چلا آیا۔ "تھانیدار سانس لینے کو رُکا۔" اس نے نامدار اور قمر خان کو ایک نظر دیکھا۔ پھر بولا۔ "بھولے نے چائے لا کر رشید کو دے دی۔ رشید خان نے لمبے لمبے گھونٹ بھرے۔ پھر آدھا گلاس ختم کر کے

وہ بولا کہ میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ اُس نے ایک دو اور گھونٹ لیے اور پھر گلاس فرش پہ رکھ کر درد سے کراہنے اور چیخنے لگا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ ہائے! میں مر گیا! میں مر گیا! خوشی مُحمّد اُس کے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ لیکن رشید خان کی حالت خراب ہوتی گئی۔ بھولا جاگیردار صاحب کو خبر کرنے چلا گیا۔ جب جاگیردار صاحب بھولے کے ساتھ مہمانوں کے کمرے میں آئے تو اُس وقت تک رشید خان کراہ رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم زور سے چیخا اور مر گیا۔ اس کی موت کی خبر ساری حویلی میں پھیل گئی اور تمام گاؤں میں شور مچ گیا۔ مگر ایک بات بہت بُری ہوئی۔"

"وہ کیا، جناب؟" نامدار نے پوچھا۔

"خوشی مُحمّد کو یہاں سے بھیج دیا گیا۔ اُس کا بیان قلم بند کرنے کے لیے اب مجھے مورکوٹ جانا پڑے گا۔" "ہاں، واقعی۔ یہ تو کسی کو خیال ہی نہیں

آیا۔" نامدار نے کہا۔ "مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو آپ کو جانا ہی پڑے گا۔"

کمرے میں تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ تھانیدار نے کہا۔ "چائے بنانے والی نوراں کو بُلاؤ۔"

تھانیدار کے ساتھ بیٹھا ہوا محرّر اُٹھا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

چند منٹ بعد وہ اندر داخل ہوا تو اُس کے ساتھ ایک کمزور سی عورت تھی، جس کا خوف سے رنگ سفید ہو رہا تھا اور سارا وجود کانپ رہا تھا۔ تھانیدار نے رُعب سے پوچھا:

"نام بتاؤ۔"

عورت کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ کئی بار اُس کے ہونٹ ہلے لیکن ایک لفظ تک نہ نکل سکا۔

"میں کیا پوچھ رہا ہوں؟ جواب دو۔ بہری ہو یا گونگی؟" تھانیدار نے غصّے سے کہا۔

"نوراں۔۔۔۔۔ نوراں بی بی۔" عورت کمزور سی آواز میں بولی۔

"خاوند کا نام؟" "جھورا، جی۔"

"جھورا کیا؟ منظور ہو گا۔" محرّر بولا۔

"ہاں جی، منجور۔" عورت نے کانپ کر کہا۔

"کیا کام کرتا ہے وہ؟"

"جی وہ تو اللہ کو پیارا ہو گیا۔ دس برس ہوئے۔" عورت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"اچھّا، اچھّا۔ تمہاری عُمر کیا ہے؟"

"جی، تین بیسی۔"

تھانیدار حقارت سے مُسکرایا۔ پھر بولا۔ "محرّر لکھ لو، ساٹھ برس۔"

"کہاں کی رہنے والی ہو؟" تھانیدار نے پوچھا۔ پتا لکھواؤ۔"

"جی یہیں کی ہوں۔ یہیں پیدا ہوئی تھی۔"

"تم جاگیر دار کی حویلی میں ملازم ہو؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"ہاں، جی۔"

"کیا کام کرتی ہو؟"

"جی، میں کھانا پکاتی ہوں۔ صُبح چھ بجے آتی ہوں کام پر اور دو بجے چلی جاتی ہوں۔ میرے بعد ایک دوسری عورت کام کرنے آتی ہے۔ شام کا کھانا وہ پکاتی ہے۔" نوراں اب رواں انداز میں بولنے لگی تھی۔

"کتنے عرصے سے حویلی میں ملازم ہو؟"

نوراں سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ "جی، ٹھیک سے تو یاد نہیں۔ نو دس برس ہو گئے ہیں۔ خاوند کی موت کے بعد نوکری کی تھی۔"

"اچھا، اب میں جو کُچھ پوچھوں، سچ سچ بتانا۔ جھوٹ بولا تو جیل بھیج دوں گا۔"

عورت کانپ کر رہ گئی۔

قاتل کون؟

تھانیدار نے پوچھا۔ ”بھولا آج تمہارے پاس باورچی خانے میں آیا تھا؟“

”ہاں جی۔“

”کیوں آیا تھا؟“

”کہہ رہا تھا، جاگیردار کے مہمان کے لیے چائے بنا دو۔“

”پھر تُم نے کیا کہا؟“

”میں نے کہا ابھی بنا دیتی ہوں۔ وہ بولا، تُم بناؤ، میں آ کر لے جاؤں گا۔“

”اچھّا۔ پھر تُم نے کیا کیا؟“ تھانیدار نے پوچھا۔ ”ایک ایک بات بتاؤ۔“

”میں نے دیگچی میں چائے کے لیے پانی ڈالا۔ پھر دیگچی کو چولھے پر رکھ دیا۔ جب پانی کھولنے لگا تو طاق میں رکھے ہوئے چائے کے ڈبّے میں سے چائے نکال کر ہتھیلی پر ڈالی۔ پھر پانی میں ڈال دی۔ جب چائے کی پتّی کھولنے لگی تو دیگچی میں سے دودھ لے کر اُس میں ڈالا۔ جب دودھ بھی کھولنے لگا تو پھر ڈبّے میں سے چینی نکال کر چائے میں ڈال دی۔ پھر چائے کو ایک گلاس میں ڈال دیا۔“

”جب تُم یہ کام کر رہی تھیں تو کیا باورچی خانے میں کوئی آیا تھا؟“ تھانیدار

نے پوچھا۔

نُوراں کُچھ سوچنے لگی، پھر بولی۔ "ہاں جی۔ بڑی بی بی آئی تھیں۔"

"بڑی بی بی کون؟" تھانیدار نے پوچھا۔

نُوراں نے قمر خان کی طرف دیکھا اور بولی۔ "چھوٹے خان کی امّاں۔"

قمر خان کے جِسم میں کپکپی سی پیدا ہوئی۔ پھر وہ بولا۔ "میری امّاں کا ذکر کر رہی ہے۔ ہم سب حویلی میں رہتے ہیں۔ مُمانی تو آپ کو پتا ہے، فوت ہو چکُی ہیں کب کی۔ گھر کا انتظام امّاں ہی سنبھالتی ہیں۔"

"اوہ!" تھانیدار نے کہا۔ "اچھّا، تو پھر کیا ہوا؟"

"جی، بڑی بی بی باورچی خانے میں آئیں اور بولیں: نوراں، کیا کر رہی

ہے؟ میں نے بتایا: جاگیر دار صاحب کے مہمان کے لیے چائے بنا رہی ہوں۔ وہ دو ایک منٹ ٹھہریں پھر چلی گئیں۔"

"کیا تم اُس وقت گلاس میں چائے ڈال چکی تھیں؟"

"ہاں جی۔" یہ کہہ کر نوراں ایک دم کانپی اور بولی۔ "خُدا کو جان دینی ہے، اِس لیے جھوٹ نہیں بولوں گی۔"

"کہو، کیا کہنا چاہتی ہو۔"

"جی، سچ یہ ہے کہ جب بڑی بی بی باورچی خانے میں آئیں تو میں مہمان کے لیے چائے کا گلاس بھر چُکی تھی اور خود جو چائے بچ گئی تھی وہ پیالے میں ڈال کر پی رہی تھی۔ بڑی بی بی نے مُجھے ڈانٹا تھا کہ میں چائے کیوں پی رہی ہوں۔ میں نے اُنھیں بتایا کہ جاگیر دار صاحب کے مہمان کے لیے چائے

بنائی تھی۔ کُچھ بچ گئی تھی، وہ پی رہی ہوں۔ پھر بڑی بی بی چلی گئیں۔“

”تُم نے جو چائے بنائی اور جس میں سے ایک گلاس مہمان کے لیے بھرا تھا، وہی چائے تُم نے پی تھی؟“

”ہاں جی۔“ نوراں بولی۔

”خوب۔“ تھانیدار نے معنی خیز نگاہوں سے نامدار کی طرف دیکھا، جو ساری کارروائی کو بڑی دِلچسپی سے سُن رہا تھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

”جی، بڑی بی بی باورچی خانے سے نکلی ہی تھیں کہ بھولا آ گیا۔ میں نے اُسے چائے کا گلاس دے دیا۔“

تھانیدار نے محرّر کی طرف دیکھا جو بیان قلم بند کر رہا تھا۔ تھانیدار کا اشارہ پا کر اُس نے نوراں سے اُس کے بیان پر انگوٹھا لگوایا۔

"اب تُم جا سکتی ہو۔ جب ضرورت پڑے گی تمہیں بُلالیں گے۔" تھانیدار نے کہا۔

جب نُوراں کمرے سے باہر نکل گئی تو تھانیدار نے محرّر کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کہو رحمت شاہ، کیا سمجھے؟"

رحمت شاہ محرّر نے داد بھری نگاہوں سے تھانیدار کر دیکھا اور بولا۔ "خان صاحب، تفتیش کرنے میں تو کوئی آپ کا مُقابلہ نہیں کر سکتا۔ کیا دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا ہے۔ قاتل تو مل گیا، جناب۔"

نامدار نے دِل چسپی سے کہا۔ "واقعی؟"

تھانیدار نے مُسکرا کر کہا۔ "جی ہاں۔ بھولا ہی قاتل ہے۔"

"وہ کیسے؟"

”کمال ہے۔“ تھانیدار بولا۔ ”آپ کی عقل مندی کی شہرت سُنی ہے میں نے، آپ بات کو پا ہی نہیں سکے۔ نوراں کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ قاتل بھولا ہے۔ اُس نے ہی باورچی خانے سے مہمان کے کمرے تک جاتے ہوئے چائے میں زہر ملایا۔ دیکھیے نا، جب نوراں نے چائے بنائی تو چائے میں کوئی خرابی نہ تھی۔ اگر اُس وقت تک چائے میں کُچھ ملایا جاتا تو نُوراں بھی چائے پی کر مر جاتی۔ اب صاف ظاہر ہے کہ بھولے نے ہی چائے میں زہر ملایا۔ بس جناب، بھولا ہی قاتل ہے۔“ یہ کہہ کر تھانیدار نے محرّر سے کہا:

”رحمت شاہ، باہر سے سپاہیوں کو بُلا کر کہو کہ وہ بھولے کو تھانے لے جائیں، اور وہاں اُس کی اچھّی طرح تواضع کریں۔ وہ خود ہی بک پڑے گا۔“

رحمت شاہ اُٹھنے لگا تو نامدار نے اچانک کہا۔ ”تھانیدار صاحب، آپ پہلے

میری ایک بات سُن لیں۔"

تھانیدار کو نامدار کا اِس طرح بات کرنا پسند نہ آیا۔ بولا۔ "جی فرمائیے۔"

اُس کی آواز میں طنز تھا۔ "جناب، آپ بھولے کو قاتل کہہ رہے ہیں، لیکن یہ تو بتائیے کہ بھولے کو رشید خان سے کیا دشمنی تھی؟ اُس نے اپنے جاگیردار کے مہمان کو زہر کیوں دیا؟"

تھانیدار تھوڑا سا چکرایا۔ اُس کے چہرے رنگ بدلا۔ اِس سے پہلے کہ وہ کُچھ بولتا، قمر خان نے زبان کھولی۔ "نامدار، تُم اِن معاملوں میں دخل نہ دو۔ تھانیدار صاحب سب باتیں بھولے سے اُگلوالیں گے۔"

"قمر خان، بات معمولی نہیں۔ سینکڑوں انسانوں کی زندگیوں کا دارومدار اِس واردات پر ہے۔ آخر سوچو، بھولے جیسے معمولی ملازم کو بھلا یہ کیا سُوجھی کہ

رشید خان کو چائے میں زہر دے کر ہلاک کر دے۔ پھر وہ زہر کہاں سے لایا؟"

تھانے دار غصّے سے اُٹھا اور بولا۔ "آپ ہمارے معاملے میں ٹانگ نہ اڑائیں جی۔ کیس عدالت میں جانا ہے۔ پکّا اور مضبوط کیس بنا کر بھیجوں گا۔ شام تک آپ خود سُن لیں گے کہ بھولے نے اقرارِ جُرم کر لیا ہے۔"

نامدار خاموش رہا۔ تھانیدار نے محرّر کو اشارہ کیا۔ وہ اُٹھا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ چند منٹ بعد کسی کے رونے کی آواز سُنائی دی۔ پھر یہ آواز دور ہوتی چلی گئی۔ محرّر کمرے میں داخل ہوا اور بولا:

"جناب، ملزم کو تھانے بھجوا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں جاگیر دار صاحب سے مل آؤں۔" یہ کہہ کر تھانیدار

کمرے سے نکل گیا۔

انوکھی چال

کمرے میں قمر خان اور نامدار کے سوا اب کوئی نہ تھا۔ نامدار نے محسوس کیا کہ قمر خان کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت سی ہے۔ اُس نے آہستہ سے کہا:

"قمر خان، مُجھے معلوم ہے کہ تم سب کُچھ جانتے ہو؟"

”کیا جانتا ہوں، میں؟“ قمر خان تیزی سے بولا۔

”یہی کہ رشید خان کو کس نے زہر دِلوایا اور اُسے کیوں مروایا گیا۔“

”میں کُچھ نہیں جانتا۔“ قمر خان نے کہا۔

نامدار نے غور سے قمر خان کی طرف دیکھا۔ وہ ناراض دِکھائی دے رہا تھا اور نامدار سے بات کرنے کا بھی روادار نہ تھا۔

”کیا ہوا، قمر خان؟ اِس طرح بے زار کیوں دِکھائی دیتے ہو؟“

قمر خان خاموش رہا۔ نامدار نے مُسکرا کر کہا۔ ”کیا بات ہے؟ بولتے کیوں نہیں؟“

”کیا بولوں؟“ اُس نے زور سے کہا۔

"میرے سوال کا جواب دو۔ تُم نے مُجھے بتایا تھا کہ جاگیردار یعنی تمہارا ماموں اُن ایلچیوں کو قتل کروانا چاہتا تھا، اور اُن کی لاشوں کو مور کوٹ پھنکوانے کا منصوبہ بن چکا تھا تاکہ مور کوٹ کے جاگیردار پر الزام لگایا جائے کہ اُس کے علاقے کے لوگ بادل کوٹ کے لوگوں سے صلح کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن اب جو ہوا وہ میری سمجھ سے باہر ہے۔"

"کون سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی؟" قمر خان نے پوچھا۔

"یہی کہ جاگیردار کو بھلا کیا ضرورت تھی کہ اپنے گھر میں رشید خان کو قتل کرواتا۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا۔"

قمر خان کھڑا ہو گیا۔ وہ غصّے سے دانت پیس رہا تھا۔

"کیا ہوا، قمر خان؟"

”میں جا رہا ہوں۔“

”میری بات کا جواب تو دے دو۔“

قمر خان ایک دم پھٹ پڑا۔ ”تم ہم پر الزام لگا رہے ہو۔ قاتل بھولا ہے، ماموں جان نہیں۔ بھولے نے ہی زہر چائے میں ملایا ہو گا۔“

”میں نہیں مانتا۔“ نامدار بولا۔

”تُم کوئی تھانیدار ہو یا مجسٹریٹ؟“ قمر خان نے بد تمیزی سے کہا۔

”قمر خان، تُم تہذیب کا دامن ہاتھ سے چھوڑ رہے ہو۔“ نامدار نے کہا۔

”تم یہ بھول گئے کہ ہم دوست ہیں۔ اب میری تمہاری دوستی باقی نہیں رہی۔“

”کیوں؟ میں نے ایسی کیا بات کہہ دی کہ ہماری برسوں کی دوستی ختم ہو گئی؟“ نامدار نے پوچھا۔

قمر خان ہونٹ کاٹنے لگا۔ پھر بولا ”میں سمجھ گیا ہوں کہ تُم یہ سب کیوں کر رہے ہو۔ اگر تمہارے والد زندہ ہوتے تو اس وقت بادل کوٹ کے جاگیردار ہوتے۔ مُجھے علم ہے کہ تمہارا دادا پہلے بادل کوٹ کا جاگیردار تھا لیکن تمہارے والد کی موت کے بعد اُس نے جاگیرداری چھوڑ دی۔ بادل کوٹ اور مور کوٹ کے درمیان دشمنی کا ذمّے دار بھی تمہارا خاندان ہی ہے۔“

”قمر خان! زبان کو لگام دو۔“ نامدار غصّے سے بولا۔ ”میرے دادا جان جب تک جاگیردار رہے، بادل کوٹ اور مور کوٹ کا کوئی آدمی نہیں مرا۔ تمہارے ماموں کے جاگیردار بنتے ہی دونوں جاگیروں میں قتل ہونے

لگے۔ اپنے ماموں کا بوجھ ہمارے خاندان کے کندھوں پر نہ ڈالو؟"

"بس بس۔ میں سب جانتا ہوں۔" قمر خان نے کہا۔ "یہ سب تمہاری سازش ہے۔ مُجھے تو شُبہ ہے کہ بھولے کو بھی زہر تم نے ہی مہیّا کیا ہو گا۔ تُم گہری چال چل رہے ہو۔ تُم چاہتے ہو کہ بادل کوٹ اور مور کوٹ میں صلح نہ ہوا۔ اور اِس سے فائدہ اُٹھا کر ہمارے خاندان اور ماموں جان کو، بدنام کر کے، تمہارا دادا تمہیں جاگیر دار بنا دے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ جب تک میرے ماموں جان زندہ ہیں، وہی علاقے کے جاگیر دار رہیں گے اور اُن کے بعد بادل کوٹ کا جاگیر دار میں ہوں گا۔"

نامدار کو اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ "تمہارے ہوش تو ٹھکانے ہیں؟ کیا کہہ رہے ہو۔"

”میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔“

”کمال ہے؟“ نامدار نے طنز سے کہا۔ ”کل تک اپنے ماموں پر الزام لگا رہے تھے کہ وہ صلح نہیں چاہتا، اُس نے آدمیوں کو بھیج کر ایلچیوں پر حملہ کروایا، اور آج تم بالکل ہی بدل گئے ہو۔“

قمر خان نے مُٹھّیاں بھینچ کر غصّے سے کہا۔ ”تُم جھُوٹ بولتے ہو۔ میں نے تُم سے ایسی کوئی بات کبھی نہیں کی۔ تُم خود ہی ایسی باتیں گھڑ کر ہمیں مُلزم بنا رہے ہو۔ یاد رکھو! اِن باتوں کا انجام اچھا نہ ہوگا۔“

قمر خان غصّے میں بولتا اور بڑبڑاتا، نامدار کو حیران اور پریشان چھوڑ کر، کمرے سے باہر نکل گیا۔

نامدار باہر نکلا۔ ابھی تک لوگ دو دو چار چار کی ٹکڑیوں میں اِدھر اُدھر

کھڑے باتوں میں مصروف تھے۔ واقعی یہ معمولی واردات نہ تھی۔ جاگیر دار نُور خان کی حویلی میں اُس کے مہمان کو زہر دے کر ہلاک کر دیا تھا، اور مہمان بھی مور کوٹ سے تعلّق رکھتا تھا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ نامدار نے مُختار اور اکرم کو اشارہ کیا تو وہ گھوڑوں پر سوار گئے۔ نامدار بوبی پر سوار ہوا اور بولا:

"تُم لوگ گاؤں چلو۔ میں آتا ہوں۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"ایک ضروری کام ہے۔" نامدار بولا۔ "دادا جان سے کہہ دینا، شام تک واپس آجاؤں گا۔"

یہ کہہ کر اُس نے بوبی کو ایڑ لگائی۔ وہ سرپٹ بھاگنے لگا اور ایک گھنٹے میں

اُس نے لمبا فاصلہ طے لیا۔ بوبی کی پیٹھ پر بیٹھا نامدار خیالوں میں گُم تھا۔ وہ اِس معمّے کو حل کرنا چاہتا تھا، لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ رشید خان کے قتل اور قمر خان کی باتوں نے اُسے بہت اُلجھا دیا تھا۔

جب وہ بادل کوٹ کی سرحد کے پاس پہنچا تو اُس نے خوشی مُحمّد اور اُس کے ساتھیوں کو جا لیا۔ وہ انھی سے ملنے کے لیے بوبی کو اتنا تیز دوڑاتا چلا آیا تھا۔ خوشی مُحمّد اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔" نامدار نے کہا۔ "میں مور کوٹ تک جا رہا ہوں، تمہارے ساتھ۔ پھر اپنے آدمیوں کے ساتھ لوٹ آؤں گا۔"

خوشی مُحمّد نے کوئی بات نہ کی اور وہ سفر طے کرتے رہے۔ جب وہ مور کوٹ کے جاگیردار فضل خان کی حویلی کے سامنے گھوڑوں سے اُترے تو

نامدار نے خوشی مُحمّد سے کہا :

"جاگیر دار نُور خان کے آدمی تمھارے جاگیر دار کو اُس کا خط دے دیں تو پھر تم جو دِل میں آئے کہہ دینا۔ خط دینے پہلے کوئی بات نہ کرنا۔"

خوشی مُحمّد نے سر ہلایا۔ وہ نامدار سے بہت متاثر تھا۔ جاگیر دار فضل خان نے بادل کوٹ کے آدمیوں کو فوراً اندر بُلا لیا۔ اُنھوں نے اپنا تعارف کرایا۔ پھر نامدار بولا۔ "میں سر دار کریم کا پوتا ہوں، نامدار۔"

"اوہ! تُم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" جاگیر دار فضل خان بولا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

بادل کوٹ کے ایک ایلچی نے خط نکالا اور جاگیر دار کو دے دیا۔ فضل خان نے خط پڑھنا شروع کیا۔ نامدار نے دیکھا کہ جوں جوں فضل خان خط پڑھتا جا رہا ہے، اُس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا ہے۔ خط پڑھ کر بولا :

”نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“

یہ کہہ کر اُس نے خوشی محمّد کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”تُم بتاؤ۔ کیا ہوا؟“

خوشی محمّد نے ہر بات تفصیل سے بیان کر دی۔ بادل کوٹ کا جنگل، اُن پر حملہ، نامدار کا آنا، اُن کے زخم صاف کرنا، پھر نامدار کے دوستوں کا آنا، مرہم پٹّی کرنا اپنے گھر لے جانا اور پھر وہاں علاج اور دوا دارو، خاطر مدارات، رات کو پھر حملہ آوروں کا آنا، صُبح کو جاگیر دار نُور خان کا آنا اور اُنہیں اپنی حویلی لے جانا، اور پھر وہاں جا کر رشید خان کا چائے طلب کرنا۔

”رشید خان نے چائے کے چند گھونٹ بھرے اور پھر وہ چیخنے اور تڑپنے لگا۔ میں اُسے سنبھالنے لگا۔ لیکن اُس کی حالت بگڑتی گئی۔ چیخ پکار کے باوجود حویلی سے کوئی نہ آیا۔ بھولا نامی ملازم جاگیر دار کو بُلانے گیا۔ لیکن

جب جاگیردار آیا تو اُس وقت رشید خان مر چکا تھا۔ پھر ایک ڈاکٹر آیا جس نے بچی ہوئی چائے ایک کُتّے کے آگے ڈال دی۔ کُتّا چائے چاٹتے ہی لوٹنیاں کھانے لگا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ چائے میں زہر تھا۔ جناب، بادل کوٹ والے فریبی، قاتل اور دھوکے باز ہیں۔ اُنھوں نے آپ کے صلح کے پیغام کی توہین کی ہے۔"

جاگیردار فضل خان کا چہرہ غصّے سے لال ہو رہا تھا۔ اُس نے تالی بجائی۔ دو ملازم اندر داخل ہوئے۔ جاگیردار نے کہا۔ "نُور شاہ اور اللہ بخش کو بلاؤ۔"

تھوڑی دیر میں دو تنومند اور بارُعب آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔

"نُور شاہ! اللہ بخش! تم دونوں ہسپتال جاؤ اور رشید خان کی لاش لے آؤ۔"

"رشید خان مر گیا، جناب؟" "ہاں۔ اُسے بادل کوٹ کے جاگیردار نے زہر

دے کر مار دیا۔" فضل خان نے کہا۔

"جناب، آپ۔۔۔۔" نُور شاہ اور اللہ بخش کے چہرے سُرخ ہو رہے تھے۔

"ابھی وہی کرو جو میں نے کہا۔ ڈاکٹر سے کہنا کہ وہ لاش رشید خان کے وارثوں کے سپرد کر دے۔ جلدی جاؤ۔۔۔" جاگیردار کے دونوں کارندے کمرے سے باہر نکل گئے۔

"خوشی محمّد، تُم بھی جاؤ۔ اپنے گھر والوں سے ملو۔ میں تمھیں جلد ہی بُلاؤں گا۔"

خوشی محمّد چلا گیا تو جاگیردار فضل خان نے جاگیردار نُور خان کا خط نکالا۔ ایک بار اسے پھر پڑھا اور پھر اُس کے پرزے پرزے کر کے بادل کوٹ کے

آدمیوں سے کہا:

"یہ میرا جواب ہے۔ اپنے جاگیر دار کو بتا دینا۔ اور تُم بھی سُنو! شام ہونے سے پہلے پہلے مور کوٹ کی حدود سے نکل جاؤ، ورنہ میں تمھاری زندگی کا ذمّے دار نہیں ہوں گا۔"

بادل کوٹ کے ایلچیوں کے ساتھ نامدار بھی جانے لگا تو جاگیر دار فضل خان نے کہا۔ "تم رُک جاؤ۔ تُم سے بھی بات کرنی ہے!"

ایسا بھی ہوتا ہے

"بیٹھ جاؤ۔" جاگیر دار نے نامدار کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ نامدار بیٹھ گیا تو جاگیر دار فضل خان بولا۔ "کیا پیو گے؟"

"جی، شکریہ۔ آپ جو کُچھ کہنا چاہتے ہیں، کہیئے۔ مُجھے شام تک واپس پہنچنا ہے۔"

"اتنی جلدی؟ سردار کریم کے پوتے کو مہمان بنا کر مُجھے خوشی ہوگی۔"

"جی، پھر کبھی سہی۔" نامدار نے کہا۔

"اچھّا، میں ابھی آیا۔ تُم ذرا بیٹھو۔"

یہ کہہ کر جاگیردار فضل خان کمرے سے نکل گیا۔ اُس نے باہر جا کر ایک ملازم کو بلایا اور اُس کے کان میں کُچھ کہا۔

"جلدی۔ جتنی جلدی ہو سکے۔" جاگیردار نے کہا۔

"حکم کی تعمیل ہوگی۔" وہ شخص تیزی سے باہر گیا، ایک گھوڑے پر سوار ہوا اور اُس کو سرپٹ دوڑانے لگا۔

اب جاگیردار فضل خان نے دو دوسرے ملازموں کو بُلایا۔ اُن سے بھی

سرگوشیوں میں باتیں کیں، اور پھر اُس کمرے کے اندر داخل ہو گیا جہاں نامدار اُس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ جاگیر دار کو دیکھ کر وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جاگیر دار نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ "تُم نے ہمارے آدمیوں کی مرہم پٹّی کی، اُن کو اپنے ہاں مہمان رکھا۔ بتاؤ، میں تمہارے اِس احسان کا کیا بدلہ دے سکتا ہوں؟"

"میں نے اپنا فرض ادا کیا تھا۔ مُجھے افسوس ہے کہ رشید خان ہلاک ہو گیا"۔

"کیا تُم چاہتے ہو کہ رشید خان کے قاتل پکڑے جائیں؟" جاگیر دار نے پوچھا۔

"میرا بس چلے تو میں خود اُنہیں پکڑ کر اُن کو اُن کے انجام تک پہنچاؤں۔"

"مُجھے تُم سے یہی توقع تھی۔ مُجھے یقین ہے کہ رشید خان کے قاتل اور اُن پر حملہ کرنے والوں کو پکڑنے کے لیے تُم میرے ساتھ پورا تعاون کرو گے۔"

"میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔" نامدار نے کہا۔

"تو پھر سُن لو کہ تُم اب مور کوٹ سے اس وقت تک نہیں جا سکتے جب تک بادل کوٹ والے رشید خان کے قاتل کو ہمارے حوالے نہیں کرتے۔ تُم میرے مہمان ہو گئے، لیکن تُم ہر وقت میرے آدمیوں نگرانی میں رہو گے۔"

"مگر۔۔۔ یہ درست فیصلہ نہیں ہے۔" نامدار نے کہا۔

"یہی فیصلہ درست ہے۔ جب جاگیر دار نُور خان کو پتا چلے گا اور جب

تمہارے دادا سردار کریم کو علم ہو گا تو وہ تمہاری سلامتی کے لیے اُس قاتل کو جلد ہمارے حوالے کر دیں گے۔ میں نے ایک آدمی کے ذریعے بادل کوٹ پیغام بھجوا دیا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے تالی بجائی۔ تین آدمی اندر داخل ہوئے، تنومند ہٹّے کٹّے، مضبوط اور توانا۔ جاگیر دار نے نامدار کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"یہ ہمارے مہمان ہیں۔ خبردار! اِن کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ بس اِن کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے۔" یہ کہہ کر جاگیر دار فضل خان کمرے سے نکل گیا۔ تینوں ملازموں نے نامدار کی طرف دیکھا اور اُن میں ایک بولا۔ "میرا نام رحیم ہے۔ میں آپ کی خدمت پر مامور کیا گیا ہوں۔ میرے ساتھ چلیے۔"

وہ تینوں اُسے ایک کمرے میں لے گئے۔ کمرا کھُلا اور شان دار تھا۔ ہر چیز

وہاں موجود تھی۔

"آپ کے لیے یہ کمرا وقف ہے۔ میں ہر وقت باہر موجود رہوں گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو آواز دے دیں۔" رحیم نے کہا۔

جب وہ جانے لگے تو نامدار نے کہا۔ "میرا گھوڑا۔۔؟"

"اُسے اصطبل میں باندھ کر چارہ ڈال دیا گیا ہے۔" یہ کہ کر رحیم باہر نکل گیا۔ نامدار کو باہر سے دروازہ بند کرنے کی آواز آئی۔ شام ہوئی۔ تاریکی پھیلنے لگی۔ پھر رات ہو گئی۔ نامدار کمرے میں بند لیٹا رہا۔ تھوڑی دیر بعد رحیم کھانا لے کر آ گیا۔ نامدار نے چند لقمے کھائے اور ہاتھ کھینچ لیا۔ اُس کی بھوک اُڑ چکی تھی۔ اُس نے سلاخوں والی کھڑکی کھولی۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا کمرے میں داخل ہوا۔ باہر گہری تاریکی تھی۔ پھر اچانک بہت سے لوگوں

کے رونے اور پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔

نامدار سمجھ گیا کہ گاؤں میں رشید خان کی لاش آ گئی ہے۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر اُس نے دروازے پر دستک دی۔ باہر سے دروازہ کھُلا اور خدمت گار رحیم اندر داخل ہوا۔

"رشید خان کی لاش آ گئی ہے؟"

"ہاں جی۔"

"جاگیر دار صاحب کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں۔"

"تُم کسی طرح میرا پیغام اُنہیں پہنچا دو۔"

"جی فرمائیے، کیا کہوں اُن سے؟"

"ان سے کہہ دو کہ مُجھے رشید خان کے جنازے میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔"

"اچھّا جی۔ میں موقع دیکھ کر آپ کا پیغام اُن کو پہنچا دوں گا۔" رحیم باہر نکلا تو دروازہ باہر سے بند ہو گیا۔

خُودکُشی

جب بادل کوٹ میں شام ہوئی تو لوگوں نے ایک ایسی خبر سُنی جس نے سب کو حیران کردیا۔

جاگیردار نُور خان کا ملازم بھولا قتل کے الزام میں تھانے لے جایا گیا تھا۔ شام کو جب لوگ اپنے اپنے گھروں میں تھے تو تھانے کے آدمی بھولے کی لاش لے کر گاؤں میں داخل ہوئے۔ جب اس کی لاش جاگیردار کی حویلی

کے باہر لاکر رکھی گئی تو سارا گاؤں وہاں جمع ہو گیا۔

سب لوگ پھٹی پھٹی نگاہوں سے لاش کو دیکھ سب رہے تھے۔ تھانیدار اپنے عملے سمیت حویلی کے دروازے پر کھڑا تھا۔ قمر خان اور اس کا والد نواز خان حویلی سے باہر نکلے۔ وہ سیدھے تھانیدار کے پاس پہنچے اور چند منٹ آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے، پھر نواز خان نے اونچی آواز میں کہا:

"تھانیدار صاحب، اب یہ آپ کا کام ہے کہ لوگوں کو حقیقت سے آگاہ کریں۔"

"مگر جاگیر دار صاحب کہاں ہیں؟" تھانیدار نے کہا۔

"وہ اس وقت آرام کر رہے ہیں۔" نواز خان بولا۔ "ہماری موجودگی ہی کافی

ہے۔"

لوگ اُن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نواز خان نے اونچی آواز میں کہا۔
"سب اِدھر آجاؤ۔ تھانیدار صاحب تمہیں کُچھ بتانا چاہتے ہیں۔"

سب لوگ اُن کے قریب آ گئے۔ اُن کی نگاہوں میں خوف تھا اور عجیب طرح کی پریشانی تھی۔

تھانیدار اتنے بڑے مجمع کو دیکھ کر کُچھ گھبرایا، پھر اُس نے کھنکار کر بولنا شروع کیا:

"گاؤں کے لوگو! تُم جانتے ہو کہ آج یہاں حویلی میں جاگیر دار صاحب کے ایک مہمان کو چائے میں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔ پولیس نے تفتیش کی اور جاگیر دار صاحب کے ملازم بھولے کو مُلزم قرار دیا اور اُسے

تھانے لے گئی۔ تھانے میں ملزم بھولے سے پوچھ گچھ کی گئی تو اُس نے
اپنا جُرم مان لیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ مورکوٹ کے لوگوں سے نفرت کرتا
ہے، کیونکہ اس کے سگے بھائی کو مورکوٹ والوں نے پچھلے سال قتل کر دیا
تھا۔ وہ اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینا چاہتا تھا، اِس لیے اُس نے رشید خان
کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ اُس نے اپنا بیان بھی لکھوا دیا اور اُس پر انگوٹھا
بھی لگا دیا۔ اِس کے بعد جب اُسے حوالات میں بند کیا گیا تو تھوڑی دیر بعد
اُس نے پانی مانگا۔ اُسے پانی دیا گیا تو وہ پانی پینے کے بعد چیخنے چلّانے لگا۔
اُس نے سزا کے ڈر سے خُودکُشی کر لی تھی۔ اُس کے پاس زہر موجود تھا جو
اُس اپنی جیب میں چھپا رکھا تھا۔"

یہ کہہ کر تھانیدار خاموش ہو گیا۔ لوگ بُڑبُڑا رہے تھے۔ ایک ساتھ مل کر بول
رہے تھے۔ نواز خان نے ہلکے سے تھانیدار کو دھکّا دے کر آگے کیا اور

بولا۔ "لوگو! خاموشی سے سُنو۔ ابھی تھانیدار صاحب کی بات ختم نہیں ہوئی۔

تھانیدار پھر کھنکارا اور کہنے لگا۔ "رشید خان کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوا۔ اُس کی موت بھی اُسی زہر سے ہوئی تھی جس سے رشید خان مرا۔ دونوں کی موت میں فرق صرف اتنا ہے کہ رشید خان کو زہر دیا گیا تھا اور بھولے نے زہر کھا کر خُود کُشی کی تھی۔" تھانیدار کے ماتھے پر پسینے کے قطرے دِکھائی دے رہے تھے۔ وہ پیچھے ہٹ گیا تو نواز خان نے زوردار آواز میں کہا۔

"اب سب اپنے اپنے گھر جاؤ۔ بھولا جاگیردار صاحب کا ملازم تھا۔ اِس کا کوئی رشتے دار بھی نہیں ہے، اِس لیے اُس کے کفن دفن کا انتظام جاگیردار صاحب کی طرف سے کیا جائے گا۔ جب اُس کے دفنانے کا وقت آئے گا تو سب کو اطلاع دے دی جائے گی۔ اب تُم اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔" لوگ آہستہ آہستہ بڑبڑاتے، باتیں کرتے، وہاں سے جانے لگے۔

اِدھر لوگ وہاں سے نکلے اور اُدھر دو گھڑ سوار حویلی کے اندر داخل ہوئے وہ خوشی محمّد کے ساتھ مور کوٹ بھیجے گئے تھے۔ نواز خان سے پوچھا۔ "چھوڑ آئے اُسے؟"

"جی ہاں۔ لیکن ہمیں جاگیر دار صاحب سے ملنا ہے۔"

"کیوں؟" نواز خان نے پوچھا۔

"پیغام دینا ہے ایک۔"

"مُجھے بتاؤ، کیا پیغام ہے۔" نواز خان نے کہا۔

"ہم پیغام صرف جاگیر دار صاحب کو ہی دیں گے۔" نواز خان نے بڑا سا منہ بنایا اور بولا۔ "تو اندر چلے جاؤ۔"

جاگیردار نُور خان اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ دستک ہوئی تو اُس نے کہا۔

"اندر آجاؤ۔"

دونوں آدمی اندر داخل ہوئے۔ اُن کے چہرے دیکھتے ہی جاگیردار نے اپنی مُونچھوں کو انگلیوں سے چھُوا اور بولا۔ "کیا بات ہے؟ بہت گھبرائے ہوئے ہو۔"

ایک آدمی نے سر جھُکا لیا، دوسرا بولنے لگا۔

"جاگیردار فضل خان نے آپ کا خط پھاڑ دیا اور کہا کہ یہی میرا جواب ہے۔"

جاگیردار نُور خان کا چہرہ تن گیا۔

"اور جناب، اُس نے نامدار کو قید کر لیا ہے۔ اُس نے آپ کو اور سردار کریم کو پیغام بھیجا ہے کہ جب رشید خان کا قاتل اُن کے سپرد کر دیا جائے گا

تو وہ نامدار کو چھوڑ دیں گے۔"

"اوہ! تو بات یہاں تک پہنچ گئی۔" جاگیردار نُور خان نے غصّے سے کانپتے ہوئے کہا۔ "نواز خان کو بُلاؤ اور ہماری سواری تیّار کرو۔ ہم ابھی سردار کریم کے پاس جائیں گے۔"

چند منٹ بعد نواز خان کمرے میں داخل ہوا۔ جاگیردار نُور خان نے اُسے ساری بات سُنا کر پوچھا۔ "اب کیا کرنا چاہیے؟"

نواز خان نے آہستہ سے کہا۔ "اب ایک ہی راستہ ہے۔ بھُولے کی لاش مور کوٹ بھجوا دی جائے اور تھانیدار کو بھی تصدیق کے لیے روانہ کر دیا جائے۔"

جاگیردار نُور خان کُچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا "ابھی نہیں۔ لیکن بھُولے کو دفنایا

بھی نہ جائے ۔ میں پہلے سردار کریم سے مل آؤں ۔"

"میں ساتھ چلوں ؟"

"نہیں ۔ البتّہ قمر خان کو بھیج دو ۔"

"قمر خان کو؟ اِس وقت ؟"

"ہاں ۔ وہ نامدار کا دوست ہے ۔ اُس سے سردار کریم پر اچھّا اثر پڑے گا ۔"

سچ کی آواز

سردار کریم خان نے ہر بات بڑی تسلّی سے سُنی اور پھر بولے۔ ''بھولے کی لاش مورکوٹ بھجوانا کُچھ اچھا نہیں لگتا۔''

''سردار۔'' جاگیردار نُور خان نے کہا۔ ''یہ بہت ضروری ہے۔ بھولا ہی رشید خان کا قاتل تھا۔''

"نہیں نُور خان۔" سردار کریم نے کہا۔ "رشید خان کو اُس نے قتل کرایا ہے جس نے رشید خان اور خوشی محمّد پر راستے میں حملہ کرایا تھا۔ یہ بہت گہری سازش ہے اور سچ پوچھو تو تُم ابھی تک نہیں جان سکے کہ سازش دراصل کس کے خلاف ہو رہی ہے۔"

"کس کے خلاف؟" جاگیر دار نے پوچھا۔

سردار کریم کے بُوڑھے چہرے پر مُسکراہٹ دِکھائی دینے لگی۔ اُنھوں نے کہا۔ "نُور خان، تمہارے خلاف سازش کی جا رہی ہے۔ ذرا سوچو تو، تُم مور کوٹ سے صلح کرنا چاہتے ہو، لیکن کوئی شخص ایسا ہے جو ایسا نہیں چاہتا۔ اپنے اِرد گرد دیکھو۔ تمھیں کوئی سازشی ضرور مل جائے گا۔"

نُور خان کا چہرہ رنگ بدلنے لگا۔ وہ بولا۔ "سردار، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ بلا

شُبہ میرے خلاف سازش کی جارہی ہے۔"

"بس تو پھر اپنے آپ کو، اپنی عزّت کو بچانے کی کوشش کرو۔"

"اور نامدار۔"

"اُس کی فکر نہ کرو۔ وہ وہاں مہمان ہے۔ فضل خان اُسے کوئی تکلیف نہ پہنچنے دے گا۔"

"تو پھر بھولے کی لاش وہاں نہ بھجوائی جائے؟"

"ہاں، اِس کی ضرورت نہیں۔"

اس گفتگو کے دوران میں قمر خان خاموش بیٹھا رہا۔

* * * * *

مور کوٹ کے قبرستان میں رشید خان کو دفن کیا جا رہا تھا۔ گاؤں کے تمام مرد جنازے میں شریک تھے۔ جاگیردار فضل خان نے نامدار کو بھی جنازے میں شرکت کی اجازت دے دی تھی۔

جب کفن دفن سے فارغ ہو کر لوگ حویلی پہنچے تو رات نصف سے زیادہ گُزر چُکی تھی۔ جاگیردار فضل خان نے کہا :

"بھائیو، اب جا کر آرام کرو۔ کل سہ پہر کو پھر سر جوڑ کر بیٹھیں گے اور سوچیں گے کہ ہمیں کیا ہے۔"

لوگ جانے ہی والے تھے کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار حویلی کے اندر داخل ہوا۔ اُسے دیکھ کر سب رُک گئے۔ جاگیردار فضل خان نے اونچی آواز میں پوچھا :

"کہو، شیر خان، کیا خبر لائے؟"

شیر خان بولا۔ "رشید خان کا قاتل جاگیر دار نُور خان کا مُلازم بھولا تھا۔ اُس نے زہر کھا کر خُودکُشی کرلی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ تفصیل سے سُنانے لگا۔ وہ سیدھا بادل کوٹ سے آ رہا تھا۔ جاگیر دار فضل خان نے اُسے مُخبری کے لیے وہاں بھیجا تھا۔

لوگ طرح طرح کے سوال پوچھنے لگے۔ شیر خان جواب دیتا رہا۔ اِس ہجوم میں نامدار بھی تھا۔ جب لوگ خاموش ہو گئے تو جاگیر دار نے کہا:

"پھر تو معاملہ ختم ہو گیا۔ قاتل نے خُودکُشی کرلی۔ نامدار کل صُبح اپنے گھر جا سکتا ہے۔"

نامدار اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "جاگیر دار صاحب۔" وہ بولا۔ اُس کی آواز جذبات

سے کانپ رہی تھی۔

"آپ نے مُجھے جانے کی اجازت دے دی ہے۔ میں آپ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن ایک بات میں چھپانا نہیں چاہتا۔" سب لوگ اُس کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔ جاگیردار فضل خان نے پوچھا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بھولا رشید خان کا قاتل نہیں ہے۔"

لوگوں میں سنسنی سی پھیل گئی۔ کئی لوگ بیک آواز چیخنے لگے۔ "تو پھر قاتل کون ہے؟"

نامدار نے ایک لمحے کے لیے توقّف کیا۔ پھر زوردار آواز میں بولا۔ "اُس کا قاتل وہ ہے، جس کے حُکم پر خوشی محمّد اور رشید خان پر جنگل میں حملہ ہوا، جس نے ہماری حویلی میں آ کر خوشی محمّد اور رشید خان کر قتل کرنے کی

کوشش کی۔ اُس کا قاتل وہ جو بادل کوٹ اور مور کوٹ میں امن و امان دیکھنا نہیں چاہتا۔ اُس کا قاتل وہ ہے جس نے بھولے کے ذریعے رشید خان کو چائے میں زہر ملا کر دیا اور پھر بھولے کو زہر دے کر ختم کر دیا۔"

"کون ہے وہ؟ بتاؤ! کون ہے وہ؟" لوگ چیخے۔

نامدار ایک لمحے کے لیے خاموش رہا، پھر بولا۔ "وہ کون ہے؟ میں نے اِس کے بارے میں ایک اندازہ لگایا ہے۔۔۔ ابھی اُس کی تصدیق باقی ہے۔"

جاگیر دار فضل خان نے ہاتھ کھڑے کر کے لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور نامدار سے پوچھا۔ "اصل قاتل کی تُم کیسے تصدیق کرو گے؟ مُجھے تمہاری آواز سچ کی آواز لگتی ہے۔"

"آپ مُجھے ابھی بادل کوٹ جانے کی اجازت دے دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جلد ہی اصل قاتل کو بے نقاب کر دوں گا اور اُس کے بعد بادل کوٹ اور مور کوٹ میں ہمیشہ کے لیے صلح ہو جائے گی۔"

"مُجھے منظور ہے۔" جاگیر دار نے جواب دیا۔

وہ آگیا

وہ ایک گہری تاریک اور سرد رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دے رہا تھا۔ لیکن نامدار بوبی پر سوار بادل کوٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پَو پھٹ رہی تھی کہ وہ بادل کوٹ پہنچ گیا۔ حویلی کے سامنے پہرے داروں نے اپنے چھوٹے مالک کو آتے دیکھا تو وہ سردار کریم کو اطلاع دینے کے لیے اندر بھاگے۔ سردار کریم نے باہر نکل کر اپنے پوتے کا استقبال کیا۔

"میں بھاگ کر نہیں آیا ہوں۔" نامدار نے بتانا شروع کیا۔ "جاگیر دار فضل خان کی اجازت سے آیا ہوں۔"

"ہمیں تم سے یہی اُمّید تھی۔" سردار کریم نے کہا۔

"مُجھے سب کُچھ معلوم ہو چکا ہے، دادا جان۔ بھولا بے قصور تھا۔"

"ہاں، مُجھے بھی یہی یقین ہے۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟" نامدار نے پوچھا۔

"میں نے جاگیر دار نُور خان کو بتا دیا ہے۔ تُم اُس پر شک نہ کرنا۔ وہ سچّے دِل سے دونوں جاگیروں کے درمیان صلح اور امن کا خواہاں ہے اور جو کُچھ ہوا اُس میں اُس کا کوئی ہاتھ نہیں۔"

"داداجان، پہلے مُجھے واقعی جاگیردار پر شک تھا، لیکن اب نہیں رہا۔"

"توکیا تُم جان چکے ہو کہ یہ کس کی سازش ہے؟"

"ہاں، داداجان۔"

"تُم قاتل تک پہنچ سکتے ہو؟"

"بالکل۔ لیکن آپ کو میری مدد کرنی ہوگی۔"

"وہ کیسے؟" بُوڑھے سردار کریم نے کہا۔

نامدار اُنہیں اپنی ترکیب بتانے لگا۔ سردار کریم بڑے غور سے سُنتے اور بار بار داد بھری نگاہوں سے نامدار کو دیکھتے رہے۔ پھر جب نامدار نے بات ختم کرلی تو بولے:

"میں ابھی آدمی روانہ کر دیتا ہوں۔ تُم اب آرام کرو۔"

"نہیں، دادا جان۔ ابھی آرام کا وقت نہیں آیا۔"

"شاباش، بیٹے۔" سردار کریم نے کہا اور پھر ایک مُلازم کو بُلا کر اُسے ہدایات دینے لگے۔

نامدار حویلی کے صحن میں پہنچا۔ مُلازموں نے بوبی کے آگے چارہ ڈال دیا تھا اور وہ اُسے رغبت سے کھا رہا تھا۔ نامدار کو دیکھ کر وہ ہنہنایا۔ نامدار محبّت سے اُس کی کمر پر ہاتھ پھیرنے لگا اور پیار سے کہنے لگا:

"میرے دوست میرے ساتھی! وقت کم ہے۔ تُم تھک گئے ہو گے۔ لیکن ہمیں ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ اب پھر ہمیں چلنا ہے۔" بوبی نے یوں سر ہلایا جیسے وہ نامدار کی ایک ایک بات کو سمجھ رہا ہو۔

نامدار پھر بوبی پر سوار ہوا۔ صُبح کے اندھیرے روشنیوں میں تبدیل ہونے والے تھے۔ اُس نے بوبی کو سرپٹ بھگا دیا۔ مُختار کے گھر کے پاس جا کر اُس نے مُلازم کو آواز دے کر کہا کہ مُختار کو بلا دے۔ مُختار آنکھیں ملتا باہر نکلا۔

"جلدی سے تیّار ہو کر اکرم کے گھر جاؤ۔" نامدار نے کہا۔

"اُس کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس چلے جاؤ۔ اُسے جس طرح بھی ہو، اپنے ساتھ لے کر ہماری حویلی پہنچ جاؤ۔"

مُختار تیزی سے واپس چلا گیا۔ نامدار نے بوبی کو تھپکی دی اور بولا۔ "چلو، میرے دوست۔" بوبی ہوا کی طرح بھاگنے لگا۔

جاگیر دار نُور خان کی حویلی کے اندر جا کر نامدار نے کسی مُلازم سے کوئی بات

کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ بے پروائی سے چلتا ہوا جاگیر دار کی خوابگاہ کے دروازے پر پہنچا اور اُس پر دستک دی۔

اندر سے کسی کے اُٹھنے کی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھلا اور جاگیر دار نے باہر دیکھا "تم!"

"ہاں، میں۔" نامدار بولا۔ "اندر آسکتا ہوں؟"

"تُم کیسے آ گئے وہاں سے۔"

"یہ نہ پوچھیے۔ اِن باتوں کا ابھی وقت نہیں۔ فی الحال میں جو کُچھ کہتا ہوں، اس پر عمل کیجیے۔"

"کہو، کیا بات ہے؟" نامدار آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ جاگیر دار کے چہرے کا رنگ بار بار تبدیل ہوتا تھا۔ پھر وہ بولا۔ "اچھا، میں اُسے ساتھ لے کر پہنچتا

ہوں۔"

"اُسے بالکل خبر نہ ہونے دیں کہ کیا معاملہ ہے۔ کسی طرح کا شک اُس کے دِل میں پیدا نہ ہونے دیں۔"

"لیکن اگر یہ سب کُچھ غَلَط نکلا تو۔۔۔؟" جاگیردار نے پوچھا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ یہ بات سچ ہے۔" نامدار نے جواب دیا۔

یہ کہہ کر نامدار کمرے سے باہر نکلا اور ببوبی پر سوار ہو کر بولا۔ "بس اب تھوڑا سا کام باقی ہے۔ پھر تم خُوب آرام کرنا۔" ببوبی ہنہنانے لگا۔

ببوبی سرپٹ بھاگتا ہوا تھوڑی دیر بعد تھانے کی عمارت میں داخل ہوا۔

"کون ہو تم؟ کِدھر مُنہ اُٹھائے چلے آ رہے ہو؟" ایک سپاہی نے اُسے

ڈانٹا۔

”تھانیدار صاحب کہاں ہیں؟“

”سو رہے ہیں۔“

”اُنہیں جگا دو۔“

”کیوں جگا دُوں؟ صُبح صُبح اُن کی ڈانٹ کھاؤں؟“

”اگر تُم نے مُجھے نہیں بتایا کہ تھانیدار کس کمرے میں سو رہے ہیں تو ساری عُمر پچھتاؤ گے۔ میں شہر سے ڈی ایس پی صاحب کا ضروری پیغام لے کر آیا ہوں۔“

”واقعی؟“ سپاہی نے کہا۔

"ہاں، بالکل۔"

سپاہی بھاگا ہوا گیا اور پھر بھاگا بھاگا واپس آیا اور بولا۔ "تھانیدار صاحب آ رہے ہیں۔"

تھانیدار بوکھلایا ہوا باہر نکلا اور نامدار کو دیکھ کر بولا۔ "تُم؟"

"ہاں، میں۔"

"تُم نے جھوٹ کیوں بولا؟"

"کیسا جھُوٹ؟

"کہ تُم ڈی ایس پی کا پیغام لے کر آئے ہو۔"

"میں جھوٹ نہیں بولتا، تھانیدار صاحب۔ ٹھیک دس آپ ہماری حویلی نہ

پہنچے تو ڈی ایس پی صاحب آپ سے ملنے خود یہاں آ جائیں گے۔ السّلامُ علیکم۔"

اتنا کہہ کر اُس نے بوبی کو چلنے کا اشارہ کیا۔ بوبی چل پڑا۔ تھانیدار اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

جب نامدار اپنی حویلی پہنچا تو دِن کے نو بج رہے تھے۔ اُس نے بوبی کو تھپکی دی۔ اُسے مُلازم کے کے حوالے کیا اور خود حویلی کے اندر داخل ہو گیا۔

ایک کمرے میں اُسے ڈاکٹر، مُختار اور اکرم بیٹھے نظر آئے۔ وہ مُسکراتے ہوئے اُن کے پاس پہنچا، اور سلام کر کے ڈاکٹر صاحب سے بولا :

"آپ نے بڑی زحمت کی، جس کے لیے میں آپ کا شُکر گزار ہوں۔"

"مگر مُجھے معلوم تو ہو کہ بات کیا ہے ؟"

"چائے وغیرہ پلوائی ہے، ڈاکٹر صاحب کو؟" نامدار نے پوچھا۔

"ملازم ناشتہ لینے گیا ہے۔" اکرم بولا۔

"ڈاکٹر صاحب، اطمینان سے ناشتا کر لیں۔ پھر بات چیت ہوگی۔"

سچ سچ بتائیے!

نامدار دادا جان کے کمرے میں داخل ہوا۔ سردار کریم نے مُسکرا کر اُسے دیکھا اور بولے: "میں اپنا کام کر چُکا ہوں۔ ساڑھے دس بجے تک وہ آ جائیں گے۔"

"شکریہ، دادا جان۔" نامدار نے کہا۔

"ہاں، دادا جان۔ میں بھی اپنا کام ختم کر چکا۔ ڈاکٹر صاحب ناشتا کر رہے ہیں۔ وہ فارغ ہو جائیں تو اُن سے باتیں ہوں گی۔"

"ہر کام احتیاط سے ہونا چاہیے۔ جلد بازی میں معاملات بگڑ جایا کرتے ہیں۔"

"ایسا نہیں ہوگا، دادا جان۔"

نامدار نے غُسل خانے میں جا کر مُنہ ہاتھ دھویا اور پھر لباس تبدیل کیا۔ اُس کے بعد اُس کمرے میں پہنچا جہاں اکرم، مُختار اور ڈاکٹر صاحب ناشتا کر رہے تھے۔ ناشتے کے بعد اُس نے مُختار کو باہر بُلا کر کُچھ کہا۔ اُس نے اکرم کو بھی باہر بُلا لیا۔ اب کمرے میں ڈاکٹر صاحب اور نامدار ہی رہ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔

"ڈاکٹر صاحب، اگر آپ ساری بات سچ سچ بتا دیں تو میں آپ کو بچا سکتا ہوں۔" نامدار نے ڈاکٹر کے چہرے پر نظریں گاڑ کر کہا۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔" ڈاکٹر بوکھلا کر بولا۔

"مطلب صاف ظاہر ہے۔" نامدار نے کہا۔ "آپ نے بھولے کی موت کی غلط رپورٹ دی۔ آپ قاتلوں سے ملے ہوئے ہیں۔ میرے پاس اِس کا ثبوت ہے، اور یہ ثبوت، ابھی تھوڑی دیر بعد، میں پولیس کے اعلیٰ افسر کے سامنے پیش کروں گا۔"

ڈاکٹر کمزور دِل کا آدمی تھا۔ وہ ایک ہی دھمکی میں چِت ہو گیا۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا:

"میرا کُچھ قصُور نہیں۔ اُنھوں نے مُجھے قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔"

"بس بس، ڈاکٹر صاحب۔ مُجھے علم ہے کہ آپ دھمکی میں آ گئے تھے۔"

"ہاں ہاں، میں ڈر گیا تھا۔ لیکن میری رپورٹ صحیح تھی۔" ڈاکٹر بولا۔

"آپ کی رپورٹ کی دُرستی کی وجہ سے میں یہ گنجائش پاتا ہوں کہ اگر آپ سچ بول دیں تو آپ کو چھُٹکارا مل سکتا ہے۔"

"میں سچ بولوں گا۔" اور ڈاکٹر آہستہ آہستہ سب کُچھ بتانے لگا۔ اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔

مُختار نے اندر آ کر کہا۔ "وہ بڑا شور مچا رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اُسے سنبھال لیتا ہوں۔ تُم اور اکرم ڈاکٹر صاحب کے پاس بیٹھو۔" اکرم اور مُختار کمرے کے اندر بیٹھ گئے۔ نامدار باہر نکل گیا۔

وہ مُسکراتا ہوا اُس کمرے میں داخل ہوا جہاں تھانیدار بیٹھا تِلملا رہا تھا۔

"تُم کہتے تھے کہ تُم جھوٹ نہیں بولتے۔ دیکھو، سوا دس ہو گئے ہیں۔"

تھانیدار نامدار کو دیکھتے ہی گرجا۔

"وہ آ چکے ہیں۔" نامدار نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب؟" تھانیدار گھبرا گیا۔

"اپنے ہسپتال کے ڈاکٹر صاحب، اور کون۔"

"مگر، اُن سے اُنہیں کیا کام آن پڑا ہے؟"

"وہی کام جو آپ سے آن پڑا ہے۔ بھولے کی موت کا مُعاملہ۔" نامدار نے کہا۔

"بھولا؟ اُس نے تو خُود کُشی کی تھی۔"

"ہاں، لیکن وہ یہ جاننے کے لیے آئے ہیں کہ جب قتل کے کسی ملزم کو تھانے لے جایا جاتا ہے تو اچھّی طرح تلاشی لی جاتی ہے یا نہیں۔ اور اگر مُلزم زہر کھا کر حوالات میں مر جائے تو اُس کی ذمّے داری خُود کُشی کرنے والے پر ہوتی ہے یا اُس تھانیدار پر جس نے ملزم کی صحیح طرح سے تلاشی لینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔"

تھانیدار کا مُنہ فَق ہو گیا۔ "اوہ! میرے خُدا! بڑی غَلَطی ہوئی مُجھ سے۔ اب کیا ہو گا؟"

"جو لوگ اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، اُن کے ساتھ وہی کُچھ ہوتا ہے جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔"

”میں۔۔۔میں۔۔۔۔سردار کریم میری سفارش کر دیں تو۔۔۔۔“

”وہ کیوں سفارش کریں گے؟“ نامدار بولا۔ ”آپ اب تک جھُوٹ بول رہے ہیں۔“

”نہیں، میں جھوٹ نہیں بول رہا۔“

”آپ سچ بولیں گے تو شاید آپ پر کسی کو رحم آجائے۔“

”میں سچ بولوں گا۔ ہاں، میں سچ بولوں گا۔“

”تو پھر بتائیے، سچ کیا ہے؟“

تھانیدار رُک رُک کر ساری بات بتانے لگا۔

ڈرامے کی تیّاریاں

مُلازم نے اندر داخل ہو کر کہا۔ "قمر خان اور جاگیر دار صاحب آ گئے ہیں۔"

"نواز خان؟" نامدار نے پوچھا۔

"وہ آنے والے ہیں۔"

"ٹھیک۔ میں آتا ہوں۔" نامدار نے کہا۔

مُلازم چلا گیا تو نامدار نے تھانیدار سے کہا۔ "آپ یہیں بیٹھیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

نامدار اُس کمرے میں گیا جہاں جاگیر دار نُور خان اور قمر خان بیٹھے تھے۔ قمر خان شرمندہ سا ہو رہا تھا۔ نامدار نے کہا۔ "آپ کا شکریہ کہ آپ تشریف لے آئے۔"

"مگر یہاں کیا تقریب ہے؟" قمر خان نے پوچھا۔

"ابھی پتا چل جائے گا۔ تمہارے والد صاحب آ رہے ہیں نا؟؟"

"ہاں، بس پہنچنے ہی والے ہوں گے۔"

اُسی وقت مُلازم نے اطلاع دی کہ نواز خان تشریف لے آئے ہیں۔ نواز خان کے چہرے پر گھبراہٹ تھی، جسے وہ چھُپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک سرکاری جیپ حویلی کے بڑے پھاٹک کے قریب آکر رُکی۔ نامدار نے آگے بڑھ کر ڈی ایس پی صاحب کا استقبال کیا۔

"سردار صاحب کہاں ہیں؟" ڈی ایس پی صاحب نے پوچھا۔

"جی، اپنے کمرے میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" نامدار نے کہا اور خاموشی سے ڈی ایس پی صاحب کو دادا جان کے کمرے میں لے گیا۔

"بھئی، آپ نے بُلوایا تو ہم چلے آئے، لیکن معاملہ کیا ہے؟" ڈی ایس پی صاحب نے سردار صاحب سے پوچھا۔

"بڑا پُراسرار معاملہ ہے۔ نامدار نے ایک ڈرامہ رچایا ہے۔"

"اچھّا؟" ڈی ایس پی صاحب بولے۔ "جیپ میں ایک تھانیدار اور دو سپاہی موجود ہیں۔ اُن کو بھی بُلوا لیں۔"

"جی، ابھی نہیں۔" نامدار بولا۔ "ہر کردار اپنے وقت پر سٹیج پر آئے گا۔"

"اچھّا تو یہ ڈرامہ اب شروع ہو جانا چاہیے۔" ڈی ایس پی صاحب بولے۔

"یس سر۔ آپ کی اجازت درکار تھی۔ میں ابھی حاضر ہوا۔" یہ کہہ کر نامدار نے اُس کمرے کا رخ کیا جہاں جاگیر دار نُور خاں، اُس کا بہنوئی نواز خان اور بھانجا قمر خان بیٹھے تھے۔ نامدار نے کہا۔ "جناب، انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ آئیے، اب تشریف لائیے۔"

جُونہی وہ دونوں سردار کریم کے کمرے میں داخل ہوئے، ڈی ایس پی صاحب کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ سردار کریم نے اُٹھ کر اُن کا اِستقبال کیا۔ پھر اُن کا تعارف کرایا۔

اس کے بعد نامدار نے سب کے سامنے جھُک کر کہا۔ "اجازت ہو تو میں

اِس ڈرامے کا پہلا کردار پیش کروں۔"

"اجازت ہے۔" ڈی ایس پی صاحب نے کہا۔

قمر خان اور نواز خان کی پریشانی بڑھ گئی۔ جاگیر دار نُور خان بھی کُچھ بے چین سا ہو رہا تھا۔ نامدار جلدی نکل کر اُس کمرے میں پہنچا جہاں ڈاکٹر بیٹھا تھا۔ اُس نے ڈاکٹر سے کہا :

"اب امتحان کا وقت ہے۔ آپ نے سچ بولا، کسی سے خوف نہ کھایا تو میں یقین دِلاتا ہوں کہ آپ کو بچا لوں گا۔"

ڈاکٹر نامدار کے ساتھ کمرے کے اندر داخل ہوا تو اُسے دیکھ کر قمر خان اور نواز خان کا رنگ اُڑ گیا۔ نامدار نے بات کا آغاز کیا :

"حضرات! یہ ڈاکٹر صاحب ہمارے بادل کوٹ کے سرکاری ہسپتال کے

انچارج ہیں اور ہمارے ڈرامے کے پہلے کردار ہیں۔ اِن کا کام بہت مختصر ہے۔ یہ چند مکالمے بولیں گے اور بس۔ اجازت ہو تو اِس ڈرامے کا پہلا سین شروع ہو۔"

"اجازت ہے۔" ڈی ایس پی صاحب نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب، آپ کو قتل کی دھمکی کس نے دی تھی؟"

"اُنھوں نے۔" ڈاکٹر نے نواز خان کی طرف اشارہ کیا۔

"نام لیجیے، ڈاکٹر صاحب۔"

"نواز خان صاحب۔"

"کس لیے؟"

”مُنہ بند رکھنے کے لیے۔“ ڈاکٹر نے گڑبڑا کر کہا۔

”وضاحت کیجیے۔ پھر آپ کا کام ختم ہوتا ہے۔“

ڈاکٹر کھنکایا۔ اُس کے سارے وجود میں لرزش تھی۔ وہ بولا۔ ”میں نے کہا تھا کہ بھُولے کی موت بھی اُسی زہر سے ہوئی ہے جس زہر سے رشید خان مرا۔ دونوں کی موت میں کوئی راز ہے۔ بھولے نے خُود کُشی نہیں کی۔ بلکہ اُسے زہر دیا گیا کہ وہ زبان بند رکھے۔ اِس بات سے روکنے کے لیے مُجھے قتل کی دھمکی دی گئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے جو رپورٹ دی تھی، وہ بالکل صحیح تھی۔“

”یہ کیا مذاق ہو رہا ہے، ہمارے ساتھ؟ یہ جھوٹ ہے۔“ نواز خان کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

ڈی ایس پی صاحب بولے۔ ”آپ مائنڈ نہ کریں۔ یہ تو ایک ڈرامہ ہے۔“

پھر اُن کا لہجہ بدلا۔ ”لیکن ایک بات یاد رکھیے۔ جب تک آپ کی باری نہیں آتی، آپ کو بولنے کا کوئی حق نہیں۔“

نامدار نے ڈی ایس پی سے کہا۔ ”سر پہلے کردار سے کوئی بات پوچھنا چاہیں تو پوچھ لیں۔“

ڈی ایس پی صاحب بولے۔ ”ڈاکٹر صاحب، آپ کی حیثیت وعدہ معاف گواہ جیسی ہے، آپ یہ بتائیے کہ کیا آپ کو یقین ہے کہ جن لوگوں نے آپ کو قتل کی دھمکی دی، وہی بھولے اور رشید خان کے قتل کے ذمّہ دار ہیں؟“

”جی ہاں۔“ جناب ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"شکریہ، ڈاکٹر صاحب۔ اب آپ تشریف رکھیے۔" یہ کہہ کر نامدار پھر باہر چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا اُس کے ساتھ تھانیدار صاحب کے علاوہ مُختار اور اکرم بھی تھے۔ تھانیدار کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ اُس نے ڈی ایس پی صاحب کو سیلوٹ کی اور بولا۔ "سر، حُکم فرمائیے!"

ڈی ایس پی صاحب بولے۔ "نامدار جو سوال پوچھے، اُس کا صحیح جواب دو۔"

"یس سر۔"

نامدار نے تھانیدار سے کہا۔ "آپ اِن کو جانتے ہیں؟" اُس کا اشارہ ڈاکٹر صاحب کی طرف تھا۔

"جی ہاں۔" تھانیدار کی کپکپاہٹ بڑھ گئی۔ گِڑگِڑا کر بولا۔ "میری عقل پر پتھرّ پڑ گئے تھے۔ مُجھ سے بڑا قصور ہوا۔ جناب، مُجھے معاف کر دیجیے۔"

"تم۔ جو پوچھا جا رہا ہے، اُس کا جواب دو۔" ڈی ایس پی نے سختی سے کہا۔

"مُجھ سے کہا گیا کہ میں بھولے کو رشید خان کا قاتل قرار دوں اور پھر بھولے کو پانی کے گلاس میں زہر ملا کر پلا دوں۔"

"آپ سے یہ کس نے کہا تھا؟" نامدار نے پوچھا۔

تھانیدار نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "نواز خان نے۔"

نواز خان اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "میں یہاں ایک منٹ نہیں رُک سکتا۔ قمر خان جاؤ، اپنی والدہ کو بُلا لاؤ۔ ہم جا رہے ہیں۔" ڈی ایس پی صاحب بولے۔ "آپ بیٹھ جائیے۔ آپ ابھی نہیں جا سکتے۔"

جاگیر دار نُور خان نے نواز خان کا بازو زور سے کھینچا اور کرسی پر بٹھا دیا۔

"اِس ڈرامے کے اگلے کردار کے لیے مُجھے باہر جانا نہیں پڑے گا۔" نامدار نے کہا۔ "وہ کردار یہیں موجود ہے۔ قمر خان، اب تمہاری باری ہے۔"

"ہیں۔ میں۔۔۔"

"ہاں، کھڑے ہو جاؤ۔" نامدار نے کہا۔ قمر خان سے کھڑا نہ ہوا جا رہا تھا۔ نامدار نے سہارا دے کر اُسے کھڑا کیا۔

"قمر خان، کیا یہ سچ ہے کہ تُم دو دِن پہلے رات کو ہماری حویلی میں آئے تھے؟"

"ہاں، آیا تھا۔"

"کس لیے؟"

"تُم سے ملنے میں اکثر آتا رہتا ہوں۔"

"تُم نے مُجھے کیا بتایا تھا؟"

"کُچھ بھی نہیں۔ گپ شپ لگا کر چلا گیا تھا۔"

"تُم نے کہا تھا کہ میں رشید خان اور خوشی مُحمّد کو گھر سے نکال دوں۔ تُم نے بتایا تھا کہ جاگیر دار نُور خان صُلح کرنا نہیں چاہتا۔ اُسی نے اپنے آدمیوں سے رشید خان اور خوشی مُحمّد پر جنگل میں حملہ کروایا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ اُن کو ہلاک کر کے اُن کی لاشیں مور کوٹ میں پھینک دی جائیں تاکہ مور کوٹ والوں پر الزام لگایا جائے کہ وہ بادل کوٹ سے صُلح کرنے پر آمادہ نہیں۔ تُم نے اپنے ماموں نُور خان پر الزام لگایا کہ۔۔۔۔۔۔"

قمر خان تیزی سے نامدار کی طرف جھپٹا اور بولا۔ "جھُوٹ بولتے ہو تُم۔

مُجھے پھنسانا چاہتے ہو۔"

نامدار نے اُسے آہستہ سے دھکّا دے کرسی پر سے بِٹھا دیا۔ "بس اتنا ہی کافی ہے۔"

کمرے میں قمر خان کی ہچکیاں گونجنے لگیں۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ نواز خان کرسی پر بیٹھا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ غصّے سے نُور خان کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ نواز خان اور قمر خان کو کچّا چبا ڈالتا۔ تھانیدار ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ ڈاکٹر کی آنکھیں جھُکی ہوئی تھیں اور اُس کی پلکوں پر آنسو تھے۔ ڈی ایس پی صاحب کا چہرہ دُرُشت ہو رہا تھا۔ سردار کریم کے بُوڑھے چہرے پر خفیف سی مُسکراہٹ تھی۔ مُختار اور اکرم حیرت زدہ کھڑے تھے۔ نامدار کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔

"آپ کی اجازت سے اب میں کُچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔" نامدار نے کہا۔

ڈی ایس پی صاحب نے اُسے شفقت سے دیکھا اور سر ہلایا۔

آخری منظر

نامدار بولنے لگا۔ "اِس خوف ناک ڈرامے کے بعض کردار اپنا جُرم مان چکے ہیں۔ میں نے جو کُچھ کیا، انصاف، امن اور اپنے وطن کی سر بُلندی کے لیے کیا ہے۔ میں رشید خان اور خوشی مُحمّد کو اپنے گھر لایا۔ وہ زخمی تھے۔ اسی رات جب قمر خان میرے گھر آیا تو اُس نے جاگیر دار کو مُلزم ٹھہرایا۔ سچّی بات ہے، میرے دِل میں جاگیر دار صاحب کے بارے میں

شک پیدا ہو گیا۔ لیکن کسی ثبوت کے بغیر میں اُن کو مُجرم نہ ٹھہرا سکتا تھا۔

پھر وہ دادا جان کے بُلانے پر آئے اور خوشی محمّد اور رشید خان کو اپنے ساتھ

لے گئے۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ معاملہ ختم نہیں ہوا، اور ایسا ہی ہُوا۔

بھولے پر قتل کا الزام لگا، لیکن میرا دِل ماننے کے لیے تیّار نہ تھا۔ اُسی

روز قمر خان نے مُجھ پر کُچھ الزامات لگائے، جس سے میرے شُبہات بڑھ

گئے، میں نُور کوٹ میں تھا، جب مُجھے بھولے، کی خبر ملی۔ میں سمجھ گیا کہ

اصل مجرم کون ہے۔ پھر میں نے ڈرامے کے سب کردار اکٹھے کیے اور

اُن کے ساتھ ایک ڈرامہ کھیلا۔ ڈرامہ کامیاب ہو چکا ہے اور حقیقت

سامنے آ گئی ہے۔ نواز خان کو سب جانتے ہیں۔ قمر خان اُس کا اِکلوتا بیٹا

ہے اور یہی جاگیر دار کا وارث سمجھا جاتا ہے، کیونکہ جاگیر دار بے اولاد

ہے۔ نواز خان نہیں چاہتا تھا کہ بادل کوٹ اور مور کوٹ کے درمیان صلح

ہو کیونکہ بادل کوٹ کو ۱۵۰ مربّع زمین جو دراصل مور کوٹ والوں کی ہے، صلح ہونے کی صورت میں مور کوٹ کو واپس کرنا پڑے گی۔ نواز خان نے ایسا منصوبہ بنایا کہ زمین بھی ہاتھ سے نہ جائے اور جاگیر دار کا پتّا بھی کٹ جائے۔ اس نے اپنے کارندوں کو ساتھ ملا کر مور کوٹ کے ایلچیوں پر حملہ کرایا۔ وہ قمر خان کو اپنا راز دار بنا چکا تھا اور قمر خان بھی جاگیر دار بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اِن کا مقصد یہ تھا کہ کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ ہو جائے کہ مور کوٹ والوں سے صلح نہ ہو سکے۔"

اچانک نواز خان اُٹھا اور چیخ کر بولا:

"بس کرو، اب۔ میں اصل مجرم ہوں۔ میں ہر جرم کا اقرار کرتا ہوں۔ رشید خان اور بھولے کا خون میری گردن پر ہے۔ خُدا کے لیے میری بیوی کو بیچ میں نہ گھسیٹو۔ اُس نے جو کُچھ کیا، میرے کہنے کیا۔ مُجھے جو چاہے، سزا

دے لو۔"

تھوڑی دیر بعد ایک تھانیدار اور کُچھ سپاہی اندر داخل ہوئے۔ ڈی ایس پی صاحب نے نواز خان اور تھانیدار کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں کو ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔

"نامدار، تُم بہت بہادر، بہت عالی ظرف اور سچّے پاکستانی ہو۔ ہمیں تُم پر فخر ہے۔" ڈی ایس پی صاحب نے کہا۔

جاگیر دار نُور خان نے نامدار کو گلے لگا کر کہا :

"تُم نے میری عزّت بچالی، بیٹے۔"

چند دِنوں بعد بادل کوٹ اور مور کوٹ کے جاگیر داروں کی ملاقات ہوئی۔

اِس ملاقات میں دونوں جاگیروں کے معزّزین بھی شامل ہوئے۔ ہوئے۔

اس تقریب میں فضل خان اور نُور خان نے اپنی اپنی پگڑیاں تبدیل کیں، اور ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔

اِس کے بعد مور کوٹ اور بادل کوٹ کے لوگوں میں کبھی کوئی جھگڑا نہ ہوا۔ ہر شخص نامدار کو دُعائیں دیتا تھا۔ ہر زبان پر اُس کے لیے تعریف تھی۔

ختم شد